آئینہ نما

آئینہ نما (۲)

شخصیات

شمیم احمد شمیم

مرتب :
قرۃ العین

نام کتاب : آئینہ نما (۲) شخصیات
ناشر : قرۃ العین
پتہ : باغات برزلہ نزد بون اینڈ جوائنٹ ہسپتال، برزلہ۔ سرینگر کشمیر
فون : ۴۳۳۷۹۵

سرورق : Deepak Maitr
کتابت : واجد علی خاں
سالِ اشاعت : جنوری ۲۰۰۲ء
قیمت : -/۲۰۰ روپے

یہ کتاب مندرجہ ذیل جگہوں پر دستیاب ہے:۔
۱۔ کشمیر بک شاپ، ریزیڈنسی روڈ، سرینگر کشمیر
۲۔ میزان نیوز ایجنسی بٹہ مالو سرینگر۔ کشمیر
۳۔ عبداللہ نیوز ایجنسی۔ امیراکدل سرینگر کشمیر

Printed at Aravali Printers & Publishers (P.) Ltd., New Delhi-110 020

فہرست

اپنی بات (قرۃ العین) ۴
حرفِ اوّل (خلیق انجم) ۷
۱۔ پیش لفظ ۲۱
۲۔ جناب شیخ محمّد عبداللہ ۲۵
۳۔ میرزا محمّد افضل بیگ ۳۷
۴۔ مولانا مسعودی ۴۴
۵۔ خواجہ غلام محمد صادق ۴۸
۶۔ مولانا فاروق صاحب ۵۷
۷۔ قاسم صاحب ۶۳
۸۔ درگا پرشاد در صاحب ۶۹
۹۔ قرہ صاحب ۷۶
۱۰۔ پیر غیاث الدّین ۸۲
۱۱۔ پریم ناتھ بزاز ۸۶
۱۲۔ راجپوری صاحب ۹۴
۱۳۔ کار صاحب ۹۸
۱۴۔ شمہ صاب ۱۰۲
۱۵۔ شیو نرائن فوطیدار ۱۰۶
۱۶۔ بہن جی ۱۱۰
۱۷۔ دینا ناتھ نادم ۱۱۴
۱۸۔ حاجنی صاحب ۱۱۹
۱۹۔ سنتوش ۱۲۳
۲۰۔ بنسی نِردوش ۱۲۷
۲۱۔ در صاحب ۱۳۴
۲۲۔ جے۔این۔زتشی ۱۳۸
۲۳۔ ست پال ساہنی ۱۴۳
۲۴۔ عبدالقادر دیوان (مرحوم) ۱۴۷
۲۵۔ موتی لعل مصری ۱۶۱
۲۶۔ رام ناتھ ۱۶۵
۲۷۔ شمیم صاحب ۱۷۰

اپنی بات

'آئینہ نما' کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے۔ پہلی جلد میں میں نے عرض کیا تھا کہ اگر آپ کا تعاون اور خلوص شامل رہا تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ دوسری جلد کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سلسلے میں مجھے مایوس نہیں ہونا پڑا اور نہ صرف یہ کہ مجھے 'آئینہ' کے پرستاروں اور مرحوم شمیم کے مداحوں کا بھرپور تعاون حاصل ہوا ہے بلکہ مجھے یہ کہتے ہوئے کافی مسرت ہو رہی ہے کہ 'آئینہ نما' کی اشاعت میرے لیے کافی حوصلہ افزا ثابت ہوئی ہے اور اسے آئندہ جاری رکھنے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ صحافتی حلقوں کے علاوہ ادبی حلقوں نے بھی اس کوشش کی سراہنا کی ہے۔ اور ریاست کے باہر بھی ادبی و ثقافتی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی ہے۔ اس حوصلہ افزائی سے میرے لیے کسی حد تک اس کام کو تاخیر سے شروع کرنے کے جرم کی تلافی ممکن ہو پائی ہے۔ مضامین کا انتخاب اشاعت کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے اب کی بار اس مشکل مرحلے کو 'آئینہ' کے دیرینہ اور والہانہ عقیدتمندوں نے آسان بنا دیا۔ 'آئینہ نما' کی اشاعت کے بعد لگاتار یہ فرمائش کی گئی کہ آئندہ شخصیات (قلمی خاکوں) پر توجہ مرکوز کی جائے۔ تیسرا صفحہ، قلمی خاکے، کھلے خط، ہفتہ وار آئینہ کے خاص کالم تصور کیے جاتے تھے۔ 'قلمی خاکے' اتنے

مقبول ہو چکے تھے کہ ایک بار آئینہ ساز نے بیشتر خاکوں کو جمع کر کے شخصیات نمبر ترتیب دیا تھا جو صحافتی و سیاسی حلقوں میں زبردست مقبول ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

میرے پاس شخصیات نمبر بھی موجود تھا اور آئینہ کے شماروں میں چھپے خاکے بھی۔ شخصیات کا انتخاب زیادہ تو نہیں تھوڑا مشکل ضرور تھا۔ میں نے اپنی دانست میں مرحوم شمیم کی ترجیحات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ خود ان کا خاکوں کو کتابی شکل دیتے وقت کہنا تھا کہ "کوشش اس بات کی گئی ہے کہ صرف ان لوگوں کو شامل کیا جائے جو کسی نہ کسی طور پر ہماری سیاسی سماجی اور ادبی زندگی میں نام پا چکے ہیں اور اس سلسلے میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں رکھی گئی ہے۔"

میں نے کسی حد تک تمام اہم شخصیات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود تمام خاکوں کو شامل کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔ بعض خاکے شخصیات نمبر سے اور کچھ اصل مسودے سے نقل کئے گئے ہیں۔

ظاہر ہے میرے لیے اس نمبر کی ترتیب و تشکیل اکیلے ہی ممکن نہیں تھی۔ اس میں بہت سے خیر خواہوں اور دوستوں کے مشورے اور مدد شامل ہے۔ میں جناب خلیق انجم کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی درخواست کو قبول کیا۔ میں ڈاکٹر محمد زماں آزردہ سربراہ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، جناب بشیر احمد ڈائرکٹر اکیڈمکس Direction Academics of Board of Secondary Education اور ڈاکٹر وحید (میڈیکل انسٹی ٹیوٹ صورہ) کی بھی انتہائی ممنون ہوں جن کی ذاتی دلچسپی اور تعاون کے بغیر زیر ترتیب کتاب کو مکمل کر لینا تقریباً ناممکن

اپنی بات

'آئینہ نما' کی دوسری جلد حاضرِ خدمت ہے۔ پہلی جلد میں میں نے عرض کیا تھا کہ اگر آپ کا تعاون اور خلوص شامل رہا تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ دوسری جلد کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سلسلے میں مجھے مایوس نہیں ہونا پڑا اور نہ صرف یہ کہ مجھے 'آئینہ' کے پرستاروں اور مرحوم شمیم کے مداحوں کا بھرپور تعاون حاصل ہوا ہے بلکہ مجھے یہ کہتے ہوئے کافی مسرت ہو رہی ہے کہ 'آئینہ نما' کی اشاعت میرے لیے کافی حوصلہ افزا ثابت ہوئی ہے اور اسے آئندہ جاری رکھنے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ صحافتی حلقوں کے علاوہ ادبی حلقوں نے بھی اس کوشش کی سراہنا کی ہے۔ اور ریاست کے باہر بھی ادبی و ثقافتی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی ہے۔ اس حوصلہ افزائی سے میرے لیے کسی حد تک اس کام کو تاخیر سے شروع کرنے کے جرم کی تلافی ممکن ہو پائی ہے۔ مضامین کا انتخاب اشاعت کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے سو اب کی بار اس مشکل مرحلے کو 'آئینہ' کے دیرینہ اور والہانہ عقیدتمندوں نے آسان بنا دیا۔ 'آئینہ نما' کی اشاعت کے بعد لگاتار یہ فرمائش کی گئی کہ آئندہ شخصیات (قلمی خاکوں) پر توجہ مرکوز کی جائے۔ تیسرا صفحہ، قلمی خاکے، کھلے خط، ہفتہ وار آئینہ کے خاص کالم تصور کیے جاتے تھے۔ 'قلمی خاکے' اتنے

مقبول ہو چکے تھے کہ ایک بار آئینہ ساز نے بیشتر خاکوں کو جمع کر کے "شخصیات نمبر" ترتیب دیا تھا جو صحافتی و سیاسی حلقوں میں زبردست مقبول ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

میرے پاس شخصیات نمبر بھی موجود تھا اور آئینہ کے شماروں میں چھپے خاکے بھی۔ شخصیات کا انتخاب زیادہ تو نہیں تھوڑا مشکل ضرور تھا۔ میں نے اپنی دانست میں مرحوم شمیم کی ترجیحات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ خود ان کا خاکوں کو کتابی شکل دیتے وقت کہنا تھا کہ "کوشش اس بات کی گئی ہے کہ صرف ان لوگوں کو شامل کیا جائے جو کسی نہ کسی طور پر ہماری سیاسی سماجی اور ادبی زندگی میں نام پا چکے ہیں اور اس سلسلے میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں رکھی گئی ہے۔"

میں نے کسی حد تک تمام اہم شخصیات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود تمام خاکوں کو شامل کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔ بعض خاکے شخصیات نمبر سے اور کچھ اصل مسودے سے نقل کئے گئے ہیں۔

ظاہر ہے میرے لیے اس نمبر کی ترتیب و تشکیل اکیلے ہی ممکن نہیں تھی۔ اس میں بہت سے خیر خواہوں اور دوستوں کے مشورے اور مدد شامل ہے۔ میں جناب خلیق انجم کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی درخواست کو قبول کیا۔ میں ڈاکٹر محمد زماں آزردہ سربراہ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، جناب بشیر احمد ڈائرکٹر اکیڈمکس Direction Academics of Board of Secondary Education اور ڈاکٹر وحید (میڈیکل انسٹی چیوٹ صورہ) کی بھی انتہائی ممنون ہوں جن کی ذاتی دلچسپی اور تعاون کے بغیر زیر ترتیب کتاب کو مکمل کر لینا تقریباً ناممکن

تھا۔ میں نے وقت بے وقت جب بھی اُن کو زحمت دی انہوں نے میری توقعات سے بڑھ کر میری مدد کی اور بر وقت اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور کتاب کی نوک پلک سنوارنے میں میرے کام کو آسان بنا دیا۔ میں حسرت گڑھا صاحب کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے کتاب کی اشاعت کے مختلف مرحلوں پر میری بھرپور مدد کی۔

میری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے ایک بار پھر اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں۔ مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

خیر اندیش

(قرۃ العین)

حرفِ اوّل

اچھا خاکہ وہی ادیب لکھ سکتا ہے جو غیر معمولی طور پر ذہین، حساس، باشعور، دانشور، انسان دوست اور انسانی نفسیات کا ماہر ہونے کے ساتھ فکر و شعور کی سطح پر اس میں ایک دانشورانہ آن بھی ہو۔ یہی نہیں وہ ایک گہرا سماجی، سیاسی شعور بھی رکھتا ہو۔ تخلیقی جوہر کا مالک ہو اور اُسے زبان پر نہ صرف غیر معمولی قدرت حاصل ہو۔ بلکہ صاحب طرز بھی ہو۔ خاکہ نگاری اِس اعتبار سے ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ خاکہ نگار کسی شخصیت کو ہمارے سامنے پوری طرح بے نقاب تو کرتا ہے لیکن اس طرح کہ اُس شخصیت کی حُرمت اور احترام بھی باقی رہتا ہے اور ہمیں تمام خرابیوں کے باوجود اس شخص سے ہمدردی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ شمیم احمد شمیم انجمن ترقی اُردو (ہند) کے کارکن بھی رہے تھے۔ اسی لیے جب وہ دلّی آتے تو اُردو گھر ضرور تشریف لاتے۔ کسی مصروفیت کی وجہ سے اُردو گھر نہ آسکتے تو ٹیلی فون پر ہی بات کرتے۔ اُن کی شخصیت کے ایک پہلو نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا اور وہ پہلو یہ تھا کہ وہ کشمیر اور اس کی فلاح و بہبود کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے۔ شمیم صاحب نے شیخ عبداللہ کا بہت دل چسپ خاکہ لکھا ہے۔ اس کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"لیکن ایک بات جس پر ان کے دوست دشمن سبھی متفق ہیں۔ وہ ہے اُن کی حب الوطنی، اُنھیں کشمیر سے بے پناہ عشق ہے۔ وہ کشمیر کی

خاطر ساری دنیا کی بادشاہی کو بھی ٹھکرا سکتے ہیں اور اُن کی ساری زندگی اس عشق کی تفسیر ہے یہ اُن کی بہت سی کمزوریوں اور نامرادیوں کا منبع بھی ہے اور اُن کی بے پناہ قوت کا خزینہ بھی۔ ۱۹۳۱ء کی صبح سے لے کر ۱۹۶۹ء کی شام تک اُن کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ اُن کی ہر سانس کشمیر کے غم، اس کے دُکھ درد اور اس کی خوشبو سے عبارت ہے اور یہی خصوصیت اُنھیں دیگر کشمیری رہنماؤں سے بلند اور ممتاز کر دیتی ہے۔ شیخ صاحب کی فتوحات کی فہرست مرتب کیجیے یا اُن کی ناکامیوں کی تفصیلات، ہر عنوان کے تحت کشمیر سے ان کی بے پناہ محبت اور عقیدت کا احوال مل جائے گا۔"

شمیم صاحب نے شیخ عبداللہ کی کشمیر سے بے پناہ محبت کے بارے میں جو کچھ لکھا، اُس کے ایک ایک لفظ کا اطلاق خود اُن پر بھی ہوتا ہے شمیم صاحب سے میری گھنٹوں بالمشافہہ باتیں ہوتی یا ٹیلی فون پر چند منٹ، دونوں صورتوں میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کشمیر، اس کی سیاست اور وہاں کے سیاست دانوں، کشمیر کی اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حالات کے بارے میں کوئی بات نہ کرتے۔ بعض اوقات یہ باتیں بہت دل چسپ ہو جاتیں۔ میں نے ایک دفعہ اپنی کسی بات پر زور دینے کے لیے غالبؔ کا ایک شعر پڑھا۔ شمیم صاحب نے پہلے غالبؔ کے شعر کی داد دی، میری بات کا جواب دیا اور پھر کہنے لگے آپ کو معلوم ہے کہ غالبؔ کی والدہ کشمیری تھیں۔ غالبؔ کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کشمیری النسل تھے۔ یہ غالباً خواجہ ہمدانی کے خاندان سے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ شمیم صاحب کبھی تو کشمیر سے باہر بھی آجایا کیجیے۔

کشمیر کے مسئلے پر میں انھیں اکثر چھیڑتا، وہ میری بات ہنس کر ٹال دیتے مگر بات بات پر کشمیر کا ذکر کرتے ضرور۔

میں آج بھی سوچتا ہوں کہ بہت کم لوگ ہوں گے، جنھیں اپنے وطن سے ایسا خلوص اور محبت اور جن کی زندگی کا مقصد ہی اُن کا اپنا وطن ہو۔

کشمیر میں جب بھی کچھ ایسا ہوتا جس کا کشمیریوں پر بُرا اثر پڑتا اس کا شمیم صاحب کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر پڑتا اور وہ موقع بے موقع کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر ضرور کرتے۔

شمیم صاحب عرصے تک سیاستدانوں سے قریب رہ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر وہ کشمیر کی فلاح چاہتے ہیں تو انھیں کشمیر کے سیاستدانوں اور سرکاری افسروں کے لیے آئینہ سازی کا کام کرنا پڑے گا تاکہ یہ حضرات آئینے میں اپنی شخصیت اور کردار کو خود بھی دیکھ سکیں۔

وہ اس مقصد کے لیے "آئینہ" نام سے ایک ہفت روزہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ مگر مالی وسائل اجازت نہیں دیتے تھے۔ غالباً ۱۹۶۷ء میں وہ اس قابل ہوئے کہ یہ ہفت روزہ جاری کر سکیں۔ اس کے پہلے شمارے کے اداریے کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے۔ "آئینہ میرے دیرینہ خواب کی تعبیر ہے" چونکہ آئینہ ایک خاص مقصد کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ روپے کمانے کے لیے نہیں۔ اس لیے ابتدا ہی سے اس کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا۔ بہت جلد "آئینہ" نے کشمیر کی سرحد سے باہر نکل کر پورے ہندوستان میں شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی اور بہت جلد "آئینہ" اور اس کے اڈیٹر شمیم احمد شمیم نے اردو صحافت میں اپنا شناخت بنا لی۔

اچھا خاکہ لکھنے کے لیے ادیب میں جو صلاحیتیں ہونی چاہئیں، وہ سب اُن

میں تھیں۔ شمیم مرحوم ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ممتاز ادیب اور اعلا درجے کے صحافی تھے۔ اگر کبھی اُردو صحافت کی تاریخ ایمانداری سے لکھی گئی تو شمیم صاحب کا نام اُن صحافیوں میں شامل ہوگا جنھوں نے اُردو صحافت کی تاریخ میں اپنے لیے ممتاز ترین مقام بنایا ہے۔ شمیم ایک غیر معمولی ذہین انسان تھے۔ کشمیر اور پورے ہندوستان کی سیاست پر جن چند لوگوں کی بہت گہری نظر تھی، اُن میں شمیم احمد شمیم بھی شامل تھے۔ کم عمر ہونے کے باوجود مرحوم سیاست کے نشیب و فراز اور سیاست کا کھیل کھیلنے والوں کی شخصیت پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ اُنھیں اُردو نثر لکھنے کا جو سلیقہ تھا وہ کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اُن کی خاکہ نگاری کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے اُن کی شخصیت کے بارے میں چند باتیں اور عرض کردوں:

وہ پوری زندگی نڈر خوف اور بے باک انسان رہے۔ اُن کے ذہن و دل میں جو کچھ ہوتا تھا، تمام مصلحتوں اور سود و زیاں سے بالاتر ہو کر اس کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔

اپنے اُن بزرگ ہم عصروں کا جو دنیا سے چل بسے ہوں، خاکہ لکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ بعض خاکہ نگار اُن شخصیتوں کو اپنے طنز و مزاح کا ہدف بناتے ہیں اور اُن کے بارے میں انتہائی مضحکہ خیز باتیں بھی کرتے ہیں۔ مرحومین کے بارے میں کچھ بھی لکھا جاسکتا ہے، کیوں کہ ایسی صورت میں خاکہ نگار سے کوئی جواب طلب کرنے والا یا جھگڑا کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔ رفتگاں کا خاکہ لکھنے والے کی مثال ایک ایسے شکاری کی ہوتی ہے جو ایک کمین گاہ میں چھپ کر شیر پر گولیاں چلاتا ہے۔ ایسی صورت میں شیر گولی چلانے والے کو جواب نہیں دے سکتا۔ اس کی مثال ایک ایسے پہلوان کی بھی ہے جو اپنے دشمن کے ہاتھ پیر بندھوا کر

ڈال دیتا ہے اور اُس بندھے ہوئے انسان پر مکّوں اور لاتوں سے اپنی طاقت کا اظہار کرتا ہے اور پھر داد طلب نگاہوں سے ناظرین کی طرف دیکھتا ہے۔

اس کے برعکس معاصرین کا خاکہ لکھنا بہت دشوار کام ہے۔ کیوں کہ خاکہ نگار جو کچھ لکھتا ہے، اُس کے ایک ایک لفظ کا اُس کو جواب دینا پڑتا ہے۔ جس شخص کا خاکہ لکھا گیا ہے، وہ جواب مانگتا ہے اور اگر صاحبِ اقتدار ہے تو خاکے میں تلخ اور سچّی باتیں کہنے کا جواب اپنے اقتدار کے ذریعے دیتا ہے جیساکہ شمیم مرحوم کے ساتھ پیش آیا۔ بعض اوقات جس کا خاکہ لکھا گیا ہے، اُس کے ہمدرد اور مداح بھی جواب طلبی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میں یہاں ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ بہت عرصہ پہلے میں نے مولانا انور صابری مرحوم کا خاکہ لکھا تھا۔ میں مولانا کا پہلے مداح تھا اور آج بھی ہوں۔ میں نے خاکے میں مولانا کی خوبیاں اپنے انداز میں بیان کی تھیں لیکن میں نے ایک اچھا خاکہ نگار بننے کی کوشش میں مولانا کی شخصیت کے کچھ کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دیا۔ جب وہ خاکہ پاکستان کے ماہنامہ "ساقی" میں شائع ہوا تو مولانا کے معتقدوں اور مداحوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میرے خلاف ایک زبردست مہم چلائی گئی۔ میں چوں کہ اس وقت کم عمر تھا، اس لیے میرے سامنے مولانا کے مریدوں کے آگے جھکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا بلکہ لکھ کر معافی مانگنی پڑی۔

میری حالت گلیلیو کی سی تھی جس نے انکشاف کیا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اور چوں کہ یہ بات چرچ کے عقائد کے خلاف تھی اس لیے اسے پکڑ کر چرچ میں لے گئے اور بہت سے صاحبِ اقتدار لوگوں نے مل کر اُسے سخت سزا کی دھمکی دی۔ گلیلیو کے سامنے معافی مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ معافی مانگنے پر اسے چھوڑ دیا گیا۔ جب وہ چرچ سے باہر آیا تو آسمان پر چمکتے ہوئے سورج پر اس کی نظر پڑی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "دکیا

کرو ں زمین تو سورج کے گرد گھومتی ہے۔" میرا بھی یہی حال تھا۔

دو سال تک شمیم احمد شمیم صاحب بڑی پابندی سے کشمیر کی سیاسی اور کچھ ادبی شخصیتوں کے خاکے لکھتے رہے۔ اگرچہ ان شخصیات کا تعلق کشمیر ہی سے تھا، لیکن صرف کشمیر ہی میں نہیں بلکہ کشمیر سے باہر بھی خاکوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ شمیم صاحب نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں۔ ان کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے تھا۔ ان میں اہم اور غیر اہم سیاسی لیڈروں کے علاوہ سرکاری ملازم، صحافی اور ادیب سبھی طرح کے لوگ شامل تھے یہ شمیم صاحب کی یہ کوشش تھی کہ وہ ایسے لوگوں کے خاکے لکھیں گے جو سیاسی، سماجی اور ادبی زندگی میں اپنے لیے کوئی مقام بنا چکے ہیں اور جو کشمیر کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور ادبی زندگی کے بہاؤ کی سمت متعین کرتے ہیں۔ یہ سمت منفی ہو یا مثبت انھوں نے چھوٹے اور بڑے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ انھیں جس کی شخصیت نے متاثر کیا، اس کا خاکہ لکھ دیا۔ مولوی عبدالحق اُردو کے بہت ممتاز خاکہ نگار تھے۔ انھوں نے ایک طرف تو حالی، مولانا محمد علی، پروفیسر مرزا حیرت، خواجہ غلام الثقلین کے خاکے لکھے ہیں تو دوسری طرف ایک معمولی سپاہی نور خاں اور اور ایک مالی نام دیو مالائی کے خاکے لکھے گئے۔ عام خیال ہے کہ مولوی صاحب کے یہ دونوں خاکے بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح شمیم صاحب نے بھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی کی شخصیت بلند ہے۔ انھوں نے تو یہ دیکھا کہ کون ایسا ہے، جس کی شخصیت کے مثبت یا منفی پہلو۔ انسانی سماج اور بالخصوص کشمیر کو متاثر کرتے ہیں۔

۱۹۶۹ء میں انھوں نے "آئینہ نما" کا شخصیات نمبر شائع کیا، جس میں چونتیس خاکے شامل تھے۔ یہ سب خاکے شمیم صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ تھے۔ اس میں ایسے خاکے بھی ہیں جو پہلے ہفت روزہ "آئینہ" میں شائع ہو چکے تھے اور کچھ ایسے خاکے بھی جو انھوں نے اس خاص نمبر کے لیے لکھے تھے۔ شمیم صاحب ایک

سچے، کھرے اور ایماندار انسان تھے۔ انھوں نے اپنی خاکہ نگاری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس سے بہتر میں نہیں کہہ سکتا۔ لکھتے ہیں :

"یہ خاکے نہ سوانح حیات کا درجہ رکھتے ہیں اور نہ عدالتی فیصلوں کا۔ ان میں افراد کے کارناموں سے زیادہ ان کی شخصیت اور کردار کی نمایاں خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کو میری نگاہ میں ان کے عناصر ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں میری پسند اور ناپسند کا بڑا عمل دخل رہا ہوگا۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ ایمانداری سے لکھا ہے۔ لیکن ایمانداری بھی ایک اضافی قدر ہے اور اس لیے مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ ہر فرد کے متعلق میری رائے بالکل صحیح اور میرا تجزیہ بالکل ایماندارانہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض شخصیات کے بارے میں، میں نے ذہنی تشدد کا مظاہرہ کیا ہو۔ اس کے بہت سے سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ میرے لیے بغاوت، برہمی اور بیزاری کا زمانہ تھا اور میں ہر اس بُت کو توڑنے کے لیے کوشاں تھا کہ جس کو بخشی صاحب کے دورِ استبداد میں اقتدار کے مندر میں جگہ مل گئی تھی اور اس لیے اس دور کی بہت شخصیات کے متعلق میرا رویّہ بے حد جارحانہ بلکہ دشمنانہ تھا۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ نئے دور کے فرعون پرانے دور کے فرعونوں سے زیادہ مختلف نہیں۔ ان میں صرف اسٹائل کا فرق ہے۔"

شمیم صاحب نے جن لوگوں کے خاکے لکھے گئے ہیں مثلاً شیخ محمد عبداللہ، خواجہ

غلام محمد صادق، مرزا افضل بیگ، مولانا مسعودی، سید میر قاسم وغیرہ اور دوسرے درجے کے ایسے سیاست داں بھی، جن کے ممکن ہے ہم نے نام سنے تو ہوں لیکن ان کے سیاسی اور سماجی کارناموں سے واقف نہیں ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نام اور کارناموں دونوں ہی سے ہم واقف نہیں ہیں مثلاً مختار صاحب، اَرتشی صاحب، تب جی، شیو ترائن فوطیدار، کار ساحب، موتی لال مصری صاحب، ان کے علاوہ شمیم صاحب نے کشمیری اور اُردو کے شاعروں کے بھی خاکے لکھے ہیں۔ ان میں بنسی نردوشس، حاجنی صاحب اور دینا ناتھ نادم وغیرہ ہیں۔ غلام رسول، سنتوش کشمیر کے بہت اہم مصور تھے۔ شمیم صاحب نے سیاسی رہنماؤں، سرکاری ملازموں، اخبار نویسوں، ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھے ہیں۔ جن شخصیتوں نے منفی یا مثبت انداز میں ان کے ذہن کو متاثر کیا اُس کا انھوں نے خاکہ لکھا ہے۔

مجھے شمیم صاحب کے خاکوں میں سب سے اچھا خاکہ وہ لگا ہے جو شمیم صاحب کے نام سے خود اپنے آپ پر لکھا ہے۔ چوں کہ وہ ایک صحافی اور سیاست داں تھے اور کشمیر کی بعض اہم شخصیتوں مثلاً شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد وغیرہ سے بہت قریب رہے تھے۔ اس کے علاوہ خود اُن کا مزاج ایسا تھا کہ وہ ہر وقت باغیانہ باتیں کرتے تھے اور پھر اُن کا معیار اتنا بلند تھا کہ اس پر بہت کم لوگ پورے اتر پاتے تھے اور چوں کہ ان میں قوّتِ برداشت نہیں تھی اور بقول خود ان کے وہ بہت منہ پھٹ تھے اور بعض اوقات گستاخی کی حدوں کو پار کر جاتے تھے۔ ان کی شخصیت بہت متنازعہ تھی لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اگر دوسروں کے بارے میں وہ سچی اور کھری باتیں کہا کرتے تھے تو خود اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ ان کے مخالف جو اُن کے

بارے میں کہا کرتے تھے، اُسے اُنھوں نے اپنے خاکے میں خاصے مبالغے کے ساتھ مزے لے کر لکھا ہے۔ خاکے کی ابتدا رہی بہت دل چسپ ہے۔ شمیم صاحب اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ بڑا بے ایمان ہے۔"

"وہ ایک نمبر کا فراڈ ہے۔"

"وہ باتوں کا سوداگر ہے۔"

"وہ بڑا منھ پھٹ اور گستاخ ہے۔"

شمیم احمد شمیم کے متعلق بہت دیر تک ایک ہی رائے پر قائم رہنا ذرا مشکل ہے۔ اس کی شخصیت بیک وقت اتنی متضاد اور مختلف کیفیات کی حامل ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والے کو ہر قدم پر اپنی رائے میں ترمیم اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میں اس کے بارے میں جو کچھ کہوں گا۔ وہ اسی حد تک صحیح ہے کہ اس خاکے کے مکمل کرنے تک میری اس کے متعلق رائے ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے مکمل ہونے کے فوراً بعد مجھے یہ احساس ہوجائے کہ یہ ہر لحاظ سے نامکمل ہے۔"

شمیم صاحب نے جب ہوش سنبھالا اور ملازمت کی تلاش میں نکلے تو بخشی غلام محمد کے دربار میں ان کی رسائی ہوگئی اور وہ بخشی صاحب کے بہت قریب ہوگئے۔ بخشی صاحب نے انھیں کشمیر کے سرکاری رسالے "تعمیر" کا ایڈیٹر مقرر کردیا۔ یہ واقعہ بیان کرکے شمیم صاحب نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ لکھنے سے پہلے ان کا بدترین دشمن بھی کئی بار سوچتا لیکن شمیم صاحب کا رسالہ ہی "آئینہ" نہیں تھا، ان کی تحریر بھی آئینہ تھی۔ اُن کے دل و دماغ میں جو کچھ ہوتا اس کا بھرپور

عکس اس آئینہ میں دکھائی دیتا۔

"ان دنوں شمیم احمد بخشی صاحب کی ناک کا بال تھے۔ بخشی غلام محمد کی سیاسی بدعنوانیوں کے لیے اخلاقی جواز تراشنا، ان کی زیادتیوں کو سیاسی جنگ کی اخلاقیات قرار دینا۔ ان کی خامیوں کو علمیت کا معیار ثابت کرنا اور ان کی ذات کو کشمیر کی نجات سے تعبیر کرنا شمیم صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان ہی دنوں بخشی اور صادق کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور بخشی صاحب نے صادق صاحب کی اینٹوں کا جواب پتھروں سے دینے کے لیے "حقیقت" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کر دیا تھا۔"

"ایک روایت کے مطابق صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اس ہفت روزے میں جتنی دشنام طرازی ہوا کرتی تھی وہ سب شمیم صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوا کرتی تھی اور شمیم صاحب اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے اور اُن کا معاوضہ حاصل کرنے کے لیے بخشی صاحب کے مخالفوں پر ہر پہلو سے وار کیا کرتے تھے بعض سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ "ترقی پسندوں" کی منظم جماعت کلچرل کانگریس میں انتشار اور پھوٹ پیدا کرنے کا کارنامہ بھی ان ہی کے ہاتھوں انجام دیا گیا۔ شمیم صاحب کی ان ہی خدمات کے عوض میں انھیں سرکاری جیپ کا ناجائز استعمال کرنے کی مکمل اجازت دی گئی تھی۔ پھر ایک دن خبر آگئی کہ بخشی غلام محمد کو شمیم صاحب کی وفاداریوں پر شبہ ہو گیا ہے۔ کافی ہاؤس اور کئی اور مقامات پر شمیم نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جن سے بغاوت اور نافرمانی کی بو آتی

ہے اور بخشی صاحب شمیم سے بے حد ناراض ہیں۔ شمیم صاحب سے ان کی سرکاری جیپ چھین لی گئی اور وہ مستعفی ہو کر علی گڑھ کو روانہ ہو گئے۔"

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو شہرت اور مقبولیت کے پیچھے رہتے ہیں۔ اگر وہ کوئی اخبار نکالتے ہیں تو وہ اخبار ان کی ذاتی پبلسٹی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کے لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔

یہ شمیم احمد شمیم کی غیر معمولی عظمت ہے کہ وہ اس کمزوری کا شکار تھے لیکن انھوں نے اس کا ایمانداری اور کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے خاکے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جو اپنے مخالفین سے خائف نہیں ہوتا۔ ان کی خود اپنے بارے میں یہ تحریر ملاحظہ ہو:

"اس میں تعمیر کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں، لیکن اس نے اپنی تمام قوتیں تخریب میں صرف کر رکھی ہیں۔ وہ سیاسی دنیا کا سعادت حسن منٹو ہے، جو چونکا دینے پر یقین رکھتا ہے۔ آپ شمیم سے نفرت کر سکتے ہیں اس کو گالی دے سکتے ہیں، لیکن آپ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی شخصیت کو منوانے کا گُر جانتا ہے اور جب سے وہ اسمبلی کا ممبر بن گیا ہے۔ اس نے اپنے اخبار "آئینہ" کو اپنی ذات کا اشتہار بنا دیا ہے اور اسی لیے مشہور اردو مصنف ظ۔ انصاری نے "آئینہ" کو شمیم صاحب کی ذہنی صحت کا بلیٹن یا ان کی "صحیح بخاری" قرار دیا ہے۔ عام لوگ "آئینہ" کو شمیم گزٹ اور شمیم نامہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ کیوں کہ پچھلے دو تین سال سے اس میں شمیم صاحب کی تقریروں ان کی مصروفیات اور ان کے لطائف کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔"

شمیم صاحب میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن ادب چوں کہ زیادہ ریاضت، لگن اور توجہ چاہتا ہے، اس لیے شمیم صاحب نے اپنے لیے صحافت کا راستہ اختیار کیا ہے۔"

شمیم صاحب شخصیتوں کا بہت قریب سے مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی خوبیوں اور خرابیوں کا بے خوف ہو کر اظہار کر دیتے ہیں۔ خواجہ غلام محمد صادق کے خاکے میں انھوں نے خواجہ صاحب کی خوبیاں بھی دل کھول کر بیان کی ہیں اور اُن کی خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس خاکے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"فائدہ یہ کہ انھیں اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں ہی وہ عزت و توقیر اور منصب حاصل ہو گیا کہ جس کے لیے بخشی غلام محمد اور قبیل کے دوسرے رہنماؤں کو غیر معمولی جدوجہد کرنا پڑی۔ تحریک آزادی کے سرکردہ رہنماؤں میں سے وہ غالباً سب سے کم مدت کے لیے جیل گئے رہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اہم اور تاریخی منصبوں پر فائز رہے ہیں۔ ان کی کم آمیزی، سنجیدگی اور لیے دیے رہنے کی عادت نے انھیں نوجوانی ہی میں بزرگ بنا دیا۔ لیکن اس سے نقصان یہ ہوا کہ صادق صاحب کبھی عوام سے براہِ راست تعلق پیدا نہ کر سکے۔ وہ عوامی زندگی کے آداب اس کے تقاضوں اور اس کے زیر و بم سے ہمیشہ ناآشنا رہے۔ انھیں لوگوں کی عزت تو حاصل ہو گئی۔ لیکن وہ ان کی محبت سے محروم رہ گئے۔ عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے عقیدت کی بلندیوں سے نیچے آکر کبھی کبھی ذہن اور ضمیر کے ساتھ ناانصافیاں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ صادق صاحب نے ان بلندیوں سے نیچے آنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ اس بے نیازی

بلکہ سرد مہری کے لیے انھیں بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے باوجود وہ آج بھی اپنی روش بدلنے کو تیار نہیں۔"

شمیم صاحب نے بعض خاکوں کی ابتدا بہت دل چسپ انداز میں کی ہے۔ انھوں نے اپنا خاکہ جن الفاظ سے شروع کیا ہے وہ نقل کیے جا چکے ہیں۔
مولانا فاروق کے خاکے کی ابتدا بھی بہت دل چسپ انداز میں کی گئی۔ شمیم صاحب لکھتے ہیں:

"کبھی کبھی کسی اچانک جھٹکے سے عورت کی ہی طرح تاریخ کا اسقاطِ حمل بھی ہو جاتا ہے۔ ۶۴-۱۹۶۳ میں کشمیر کی تاریخ نے، جسے بخشی غلام محمد نے دس سال تک زر اور زور کی معجونِ مرکب کھلا کھلا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ موئے مبارک کے ہنگامۂ نشور میں ہڑبڑا کر انگڑائی لی اور اس کے رحم میں پلنے والے عجیب الخلقت بچّے کو وقت سے کچھ پہلے ہی پیدائش کا مرحلہ طے کرنا پڑا۔ مولانا فاروق کا سیاسی طلوع اس غیر معمولی وضع حمل کا ایک کرشمہ ہے۔ عام طور پر ایسے نوزاد باہر کی لو لگتے ہی عدم کو سدھار جاتے ہیں، لیکن فاروق صاحب کی سیاسی بالیدگی حیران کُن حد تک تیز اور صحت آور رہی ہے۔ اس حیرت ناک بقا کے لیے کچھ تو اس وجود میں چھپی ہوئی توانائی ذمہ دار ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم بات کشمیر کے وہ سیاسی تضادات ہیں، جن میں انھوں نے آنکھ کھولی۔"

پچھلے تیس بتیس سال میں اُردو میں خاکہ نگاری کے فن، اس کے آغاز وارتقا پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن کسی ادیب یا نقاد نے خاکہ نگار کی حیثیت سے شمیم احمد شمیم کا ذکر نہیں کیا جس کی وجہ

صرف یہ ہے کہ شمیم صاحب کے تمام خاکے ہفت روزہ ''آئینہ'' میں دبے پڑے تھے۔ ان کی چھوٹی بہن قرۃ العین کو تیس بتیس سال بعد خیال آیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ خیال تو آیا۔ انھوں نے پچھلے سال ''آئینہ نما'' کے نام سے شمیم صاحب کے ایسے ترانوے مضامین مرتب کر کے شائع کئے ہیں جو انھوں نے کشمیر کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی موضوعات پر لکھے تھے۔ ''آئینہ نما'' کے یہ مضامین ہوں یا ان کے خاکے۔ یہ سب کشمیر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں اور کشمیر کی تاریخ کا اہم حصّہ ہونے کے علاوہ فن خاکہ نگاری میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

خلیق انجم

پیش لفظ

عظیم ناول نگار ٹالسٹائی نے اپنے شہرہ آفاق ناول "امن اور جنگ" کے آخری حصے میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے انقلابات اور تاریخی واقعات افراد کی ذاتی خصوصیات یا حادثات کی بجائے تاریخی قوتوں کے مسلسل عمل، تصادم اور ردعمل کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ٹالسٹائی نے دنیا کی تاریخ سے مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ عظیم اور تاریخی شخصیتیں خود تاریخی تقاضوں کی پیداوار اور انقلابات کی مخلوق ہوتی ہیں، اور یہ کہنا غلط ہے کہ ایک فرد خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، ایک بڑے انقلاب یا بڑی تحریک کو جنم دے سکتا ہے۔ اس بحث سے ٹالسٹائی کا مقصد نپولین کی عظمت کو کم کر کے یہ ثابت کرنا تھا کہ نپولین کی فتوحات، اس کی عظمت اور بے پناہ شہرت میں نپولین کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بجائے ان تاریخی قوتوں کا دخل ہے کہ جنہوں نے نپولین کو جنم دے کر اس کا راستہ متعین کر دیا۔ ٹالسٹائی نے اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ کچھ دیر کے لیے پڑھنے والے ٹالسٹائی کے استدلال سے اس درجہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ تاریخ کے بہتے ہوئے سمندر میں نپولین جیسی شخصیات ایک حقیر تنکے کی طرح بہتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں، لیکن صرف کچھ دیر کے لیے!

ٹالسٹائی کی مدلّل بحث، اس کی بے مثال منطق اور لاجواب طرز تحریر کے باوجود نپولین کی غیر معمولی شخصیت کا جادو قائم رہتا ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے

ہیں، کہ نپولین اپنے دور کی تاریخی قوتوں کی مخلوق ہی نہیں ان کا خالق بھی تھا۔ نپولین نہ ہوتا تو فرانس اور یورپ کی تاریخ یقیناً مختلف ہوتی، کیونکہ ہر بڑی شخصیت تاریخ کے بہاؤ کو بہت حد تک متاثر کرتی ہے اور جو بات نپولین جیسے فاتح اور عظیم کردار کے متعلق صحیح ہے، وہ چھوٹے پیمانے پر ان سب لوگوں کے بارے میں صحیح ہے، جو اپنی چھوٹی سی دنیا میں تاریخ کے بہاؤ کو کسی نہ کسی طور متاثر کرتے رہتے ہیں۔ شخصیات کے متعلق میرا یہی نکتۂ نظر "آئینہ" کے شخصیات نمبر کی شانِ نزول ہے!

"آئینہ" کی اشاعت کے پہلے دو سال تک شخصیات کو ایک مستقل عنوان کی حیثیت حاصل تھی، اور اس عنوان کے تحت میں نے بہت سی سیاسی شخصیات کے قلمی چہرے لکھے، یہ سلسلہ کافی مقبول ہوا اور بہت سے دوستوں نے یہ مشورہ دیا، کہ ان قلمی چہروں کو کتابی صورت میں شائع کر کے محفوظ کر دیا جائے۔ پھر کچھ دن بعد "شخصیات" کو مستقل عنوان کی حیثیت سے جاری رکھنا ممکن نہ ہو سکا اور میرے ذہن سے ان خاکوں کو کتابی شکل دینے کی بات بھی اُتر گئی! آئینہ کی پانچویں سالگرہ خاص نمبر نکالنے کا موقع آیا تو میں نے سوچا کیوں نہ شخصیات ہی پر مشتمل ایک خاص نمبر شائع کیا جائے۔ اس میں بہت سے خاکے ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں لکھے گئے ہیں۔ اور یہ پہلے ہی "آئینہ" میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی خاکے خاص طور پر شخصیات نمبر ہی کے لیے لکھے گئے ہیں اور یہ پہلی مرتبہ شائع ہو رہے ہیں۔ نئے خاکوں میں شیخ صاحب، صادق صاحب، بیگ صاحب، قرہ صاحب اور مولانا فاروق صاحب کے خاکے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ پرانے خاکوں کو بھی "اپ ٹو ڈیٹ" لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان میں کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ بہت سی شخصیات کے متعلق میری رائے اب وہ نہیں جو پہلے تھی!

یہ خاکے نہ سوانح حیات کا درجہ رکھتے ہیں اور نہ عدالتی فیصلوں کا، ان میں

افراد کے کارناموں سے زیادہ ان کی شخصیت اور کردار کی ان نمایاں خصوصیات کو، اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن کو میری نگاہ میں ان کے عناصر ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں میری پسند اور ناپسند کا عمل دخل رہا ہوگا۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے ایمانداری سے لکھا ہے۔ لیکن ایمانداری بھی ایک اضافی قدر ہے۔ اور اس لیے مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ ہر فرد کے متعلق میری رائے بالکل صحیح اور میرا تجزیہ بالکل ایماندارانہ ہے ہو سکتا ہے کہ بعض شخصیات کے بارے میں، میں نے ذہنی تشدد کا مظاہرہ کیا ہو۔ اس کے بہت سے سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ میرے لیے بغاوت، برہمی اور بیزاری کا زمانہ تھا اور میں ہر اس بُت کو توڑنے کے لیے کوشاں تھا، کہ جس کو بخشی صاحب کے دور استبداد میں اقتدار کے مندر میں جگہ مل گئی تھی اور اسی لیے اس دور کی بہت سی شخصیات کے متعلق میرا رویہ بے حد جارحانہ بلکہ دشمنانہ تھا، لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا، کہ نئے دور کے فرعون پرانے دور کے فرعونوں سے زیادہ مخلص نہیں ہیں، ان میں صرف سٹائل کا فرق ہے!

شخصیات نمبر میں سیاسی لیڈر بھی شامل ہیں اور سرکاری ملازم بھی۔ اخبار نویس بھی اور ادیب بھی، اور کوشش اس بات کی گئی ہے، کہ صرف ان لوگوں کو اس میں شامل کیا جائے، جو کسی نہ کسی طور پر ہماری سیاسی، سماجی اور ادبی زندگی میں نام پا چکے ہیں۔ اور اس سلسلے میں چھوٹے بڑے کی تمیز روا نہیں رکھی گئی ہے۔ اسی لیے کچھ عظیم شخصیات کے ساتھ ساتھ بعض حقیر سی شخصیات کا ذکر بھی آگیا ہے۔ تا کہ گذشتہ بیس برس کے تاریخی عمل کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے، کہ یہ نمبر اس لحاظ سے نامکمل ہے، کہ اس میں بعض بہت اہم اور معروف شخصیات کے خاکے شامل نہیں ہیں۔ لیکن اس خاص نمبر کو اس سے زیادہ ضخیم بنانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

اس لیے ارادہ ہے، کہ اگلے سال اس کا دوسرا حصہ شائع کر دیا جائے، کہ جس میں ان شخصیات کا ذکر ہوگا، جن کے ذکر کے بغیر کشمیر کی تاریخ نامکمل رہے گی!

"آئینہ" کا یہ خاص نمبر غیر معمولی تاخیر کے بعد شائع ہو رہا ہے، اس کی وجہ میری وہ غیر معمولی مصروفیات ہیں کہ جن سے فی الحال مجھے نجات ملنا ممکن نہیں۔ ستمبر کے دوسرے ہفتے کے دوران مجھے قانون سازیہ کے ایک وفد کے ہمراہ لداخ جانا پڑا، جس کی وجہ سے یہ خاص نمبر وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ اب کی بار "آئینہ" کی پانچویں سالگرہ کی تقریب بھی منعقد نہ ہو سکی اور اس لیے میں "آئینہ" کے ان ہزاروں عقیدت مندوں سے معذرت خواہ ہوں کہ جو بڑی بے صبری سے اس تقریب کا انتظار کر رہے تھے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

جناب شیخ محمد عبداللہ

شیخ عبداللہ ایک شخصیت نہیں، ایک کتاب کا نام ہے۔ ایک ایسی کتاب کا کہ جس کا ہر باب ایک نئے عہد کی تمہید ہے۔ وہ کشمیر کی تاریخ اور تقدیر دونوں ہی کا عنوان ہیں اور اُن کی دیوزاد شخصیت آج پورے اٹھائیس برس سے ہماری کائنات پر چھائی ہوئی ہے، اُن کا وجود ہمارا سب سے قابل فخر اور بیش قیمت سرمایہ بھی ہے اور ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ بھی۔ وہ ہماری امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بھی ہیں اور مدفن بھی۔ ان کی ذات سے ہماری تحریکِ آزادی کی صبح بھی عبارت ہے اور شام بھی۔ وہ ایک خوبصورت آغاز اور ایک حسرتناک انجام کی علامت ہیں!

شیخ محمد عبداللہ کا نام میں نے پہلی بار کب سُنا تھا، مجھے اچھی طرح یاد نہیں، لیکن انھیں میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۴۴ء میں دیکھا تھا۔ وہ کھدّر کا کُرتا پاجامہ اور جواہر واسکٹ پہنے شوپیان کے قلعہ باغ میں ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کررہے تھے۔ میں اُن دنوں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور میرے لیے ان کی تقریر کا مفہوم سمجھنا محال تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں اس مقناطیسی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں جوں توں کرکے سٹیج تک پہنچ گیا۔ اور اُن کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ایک والنٹیر کے ہاتھوں پٹتے پٹتے بچ گیا۔ سٹیج پر بیٹھے ہوئے ایک داڑھی والے صاحب نے والنٹیر کو ٹوکتے ہوئے کہا "کیوں روکتے ہو، آنے دو بچے کو"، اور میں شیخ صاحب کے بالکل قریب سٹیج پر آکر بیٹھ گیا۔ داڑھی والے

صاحب مولینا محمد سعید سعودی تھے! یہ چوبیس برس پرانی بات ہے۔ اس وقت کسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ کھدر پوش، بلند قامت اور بلند آہنگ کشمیری بین الاقوامی شہرت اور اہمیت حاصل کرے گا۔ میں تو صرف یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ہزاروں لوگ کس طرح خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ اس کی تقریر سن رہے تھے۔ جلسہ ختم ہو گیا شیخ صاحب موٹر میں سوار شہر کی طرف روانہ ہو گئے اور موٹر کے ارد گرد ہزاروں لوگ "شیر کشمیر" زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے ان کے ساتھ گئے۔ ان بہت سے لوگوں میں سے ایک میں بھی تھا!

ایک سال بعد شیخ صاحب دوبارہ شوپیان آئے، ان دنوں میں نے اپنے ایک دوست محمد یوسف ٹینگ کے ساتھ مل کر ینگ بوائز ایسوسی ایشن کے نام سے نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی تھی۔ اس تنظیم کے صدر کی حیثیت سے شیخ صاحب سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات عزیز شاہ کے مکان میں ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ میں نے ان سے کیا پوچھا، لیکن یہ بات مجھے یاد ہے انہوں نے بڑی شفقت اور محبت سے میری ہر بات کا جواب دیا۔ اور مجھے مشورہ دیا کہ ینگ بوائز ایسوسی ایشن کی تنظیم کو پورے علاقے میں پھیلا دوں۔ شام کو ایسوسی ایشن کے اہتمام سے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں زیادہ تر طالب علموں اور نوجوانوں نے شرکت کی شیخ صاحب نے ایک مفصل تقریر میں اپنی ابتدائی زندگی کے کچھ اہم واقعات بیان کیے کہ کس طرح اپنے ہم وطنوں کی بے بسی اور بے کسی کو دیکھ کر ان کے دل میں اس دنیا کو بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ شیخ صاحب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا، اس کے بعد ان سے میری دوسری ملاقات ۱۹ سال کے بعد جموں سپیشل جیل میں ہوئی۔ جہاں اُن کے خلاف مقدمۂ سازش کی سماعت ہو رہی تھی۔ ۱۹ سال کے اس طویل وقفے میں دنیا اتنی بدل چکی تھی، کہ اُسے پہچاننا مشکل تھا۔ شیخ صاحب پانچ سال وزیر اعظم رہ کر اب دس سال سے قید تھے اور ان کے بہت سے نام لیوا

بھی جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں سڑ رہے تھے۔ جس شخص کے نام سے کشمیر کی جنگ آزادی عبارت تھی۔ اس شخص کا نام لینا جرم قرار پایا تھا۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں شیخ محمد عبداللہ کا سیاسی مستقبل تاریک تھا۔ اور بخشی غلام محمد کو یہ اطمینان تھا کہ شیخ صاحب کی باقی زندگی جیل میں گذر جائے گی۔ ان ۱۹ برسوں میں خود میرے ذہن اور میری زندگی میں کچھ اہم انقلاب رونما ہوئے تھے۔ اب واقعات اور شیخ صاحب کے متعلق میرے فیصلوں میں اعتقاد اور عقیدت کی بجائے حقیقت پسندی اور عقلیت کا عنصر غالب ہو گیا تھا۔ جموں جیل کے برآمدے میں شیخ صاحب کے ساتھ آدھے گھنٹے کی گفتگو کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ شیخ صاحب، بنیادی طور پر مسلمان ہیں۔ اور ان کی سیاست کا محور اسلام ہے نیشنلزم اور کانگریس سے اُن کی وابستگی ایک ایسا اصولی سمجھوتہ تھا کہ جو ان کے بنیادی نظریات اور معتقدات کے عین مطابق تھا۔ لیکن جواہر لعل نہرو کی لادینیت اور مہاتما گاندھی کی مذہبیت سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ انہیں ابوالکلام آزاد کی صف میں بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ آزاد شیخ صاحب کے مقابلے میں زیادہ وسیع المشرب، آزاد خیال اور جدت پسند تھے۔ مذہب سے اُن کی وابستگی میں اُن کی گہری علمی بصیرت کا دخل تھا۔ اس کے مقابلے میں شیخ صاحب کی مذہبیت ماحول، روایات، عقیدت اور اعتقاد کی پیداوار ہے۔ ان کے ایک گہرے دوست اور دیرینہ رفیق پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی کتاب "انسائڈ کشمیر" میں شیخ صاحب کے مذہبی کٹڑپن اور قوم پرستی کو ایک ایسا تضاد قرار دیا ہے کہ جسے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔ بزاز صاحب کا یہ فیصلہ غلط تھا۔ انہوں نے شیخ صاحب کے مذہبی نظریات اور قومیت کے تصور کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ وہ بے صبری کا اظہار کر کے مایوس نہ ہو جاتے

تو انہیں شیخ محمد عبداللہ کے کردار، اُن کے عمل اور ان کی قوم پرستی میں ایک گہری ہم آہنگی نظر آتی۔ وہ کٹر مسلمان ہونے کے باوجود فرقہ پرست نہیں تھے۔ اور یہ اُن کی شخصیت کا ایک ایسا تضاد ہے کہ جو ان کی سیاسی زندگی کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ پروفیسر ایس، ایل پنڈتا نے میرے نام ایک خط (آئینہ ۵ نومبر ۱۹۸۶ء) میں شیخ صاحب کے کردار کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے، ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جس سے اندازہ ہوگا کہ قوم پرست بننے سے بہت پہلے وہ انسان دوستی اور مذہبی رواداری پر نہ صرف یقین رکھتے تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتے۔ پنڈت صاحب لکھتے ہیں :-

"ستمبر ۱۹۳۲ء کی بات ہے کہ جب مسلمانوں کے لیڈر کی حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ کا نام متعارف ہوئے صرف ایک سال کا عرصہ گزرا تھا۔ سری نگر شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی نمودار ہوگئی کہیں کہیں ہلڑ بازی کا مظاہرہ بھی ہوا۔ سارا ہنگامہ، فساد، طلبا کے دو گروہوں میں مہاراجہ کے جنم دن پر جھگڑے کی بناء پر شروع ہوا۔ اور میرے دوست مجھے معاف کریں گے کہ جھگڑا کچھ ہندو لڑکوں نے ہی شروع کیا۔ میں اُن دنوں پنڈتوں کی بھاری اکثریت والے علاقے میں رہتا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح ایک عمر رسیدہ کشمیری پنڈت نے ایک غریب مسلمان کو اپنے ہی فرقے سے تعلق رکھنے والے غنڈوں سے بچایا۔ لیکن حکام بالکل غافل بیٹھے رہے اور تین دن اور رات سری نگر میں مکمل محاصرے کی سی صورت رہی۔ بالآخر شیخ صاحب میدان میں آئے، وہ ان دنوں بالکل نوجوان تھے اور کسی ہندو نے اُن کو اپنا لیڈر نہیں مانا تھا۔ وہ سب سے پہلے ایک ہندو ماتمی جلوس کے ساتھ گذرے، اور جب تک جلوس مردے کو دفنا کر بحفاظت واپس آیا، اس کے ساتھ رہے۔ اس اقدام سے پورے شہر میں بہت ہی خوشگوار اثر ہوا اور چند گھنٹوں میں شہر کی حالت بالکل بدل گئی۔ اس کے

بعد شیخ صاحب نے ہندو لیڈروں کے ساتھ شہر کا دورہ کیا اور گلی کوچوں میں ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر جلسے ہوئے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ میں نے شیخ صاحب کو پہلی مرتبہ عام جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے سُنا۔‘‘

یہ بات تقریباً بھلائی جا چکی ہے کہ شیخ صاحب سائنس کے طالب علم تھے اور انہوں نے علی گڈھ سے کیمسٹری میں ایم، ایس، سی کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کردار گفتار یا اُن کی شخصیت سے کہیں یہ مترشح نہیں ہوتا ہے، کہ اُنہیں سائنس سے کوئی دل چسپی ہو سکتی ہے۔ سائنس کی ڈگری شیخ صاحب کی فکر یا اُن کے مزاج کو کسی طور بھی متاثر نہیں کر سکی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سائنس کا مضمون کسی طبعی مناسبت کی بجائے صرف اس لیے اختیار کیا تھا کہ سائنس پاس نوجوان کو جلد نوکری ملنے کا زیادہ امکان تھا اور ایم، ایس، سی پاس کرتے ہی شیخ صاحب کو نوکری مل بھی گئی۔ وہ ایس، پی، ہائی اسکول میں ۶۰ روپے ماہوار بطور ٹیچر کے تعینات کر دیئے گئے۔ بہت کوشش کے باوجود میں کسی ایسے شخص سے نہیں مل سکا ہوں کہ جو اس دوران میں شیخ صاحب کا طالب علم رہا ہو۔ اور جس نے اس سے سائنس پڑھی ہو۔ تاکہ یہ اندازہ ہو جاتا کہ بحیثیت معلم کے وہ کس حد تک کامیاب تھے۔ قیاس غالب ہے کہ بطورِ استاد کے وہ زیادہ کامیاب نہ رہے ہوں گے۔ کیوں کہ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ انہوں نے بحالتِ مجبوری نوکری تو قبول کر لی تھی لیکن ان کا دل کہیں اور تھا۔ اور پہلا موقع ملتے ہی اُنہوں نے اپنی گردن سے یہ طوق اتار دیا۔ مورخ ہمیشہ یہ قیاس آرائی کرتے رہیں گے کہ اگر شیخ صاحب کو سرکاری ملازمت کی پابندیاں راس آ گئی ہوتیں، تو کشمیر کی تاریخ اور یہاں کی سیاست آج کس درجہ مختلف ہوتی۔ وہ تحریک آزادی کی مخلوق بھی ہیں۔ اور بہت حد تک اس کے خالق بھی۔ اور ۱۹۳۱ء سے لے کر آج تک اگر تحریک آزادی

کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو شیخ محمد عبداللہ کو سمجھے بغیر یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آزادی کی جدوجہد کے ایک ایک لمحے پر ان کی شخصیت اور فکر کی گہری چھاپ ہے اور جب آنے والا مورخ کشمیر کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو اُسے ہر قدم پر ان کا نام دہرانا پڑے گا! ۱۹۳۹ء مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کا فیصلہ اگرچہ ایک جماعتی فیصلہ تھا اور اس میں شیخ صاحب کے سبھی ساتھی شامل تھے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ فیصلہ شیخ صاحب کا تھا اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اس بات کا اعتراف کیا ہے، کہ اگر شیخ صاحب مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل (بدلنے) پر راضی نہ ہوتے تو ان کے سبھی ساتھی مل کر بھی اس کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے تھے۔ یہ انہی کی ہمت اور قیادت کا اعجاز تھا، کہ غیر معمولی اہمیت اور دور رس نتائج کا یہ تاریخی فیصلہ اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا اور کشمیر کی تحریک آزادی ایک ایسے دور میں داخل ہو گئی کہ جہاں اس کا سیکولر کردار اور قوم پرستی کا آہنگ پہلے سے زیادہ واضح اور بلند ہو گیا اور ہماری آزادی کی جدوجہد اپنے مخصوص کردار کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک حصہ بن گئی۔ ہندوستان کے قومی رہنماؤں نے اس مرحلے پر شیخ محمد عبداللہ کی اہمیت اور عظمت کا صحیح اندازہ کرکے دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ شیخ صاحب نے اپنے سامنے نئی وسعتیں دیکھ کر بڑی محبت سے یہ ہاتھ تھام لیا۔ اور رفتہ رفتہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہرلال نہرو شیخ صاحب کے سیاسی امام ہو گئے۔ اور کشمیر کی سیاست بالواسطہ طور پر انڈین نیشنل کانگریس کے زیر اثر آگئی۔ جواہر لعل نہرو کی جوہر شناس نگاہوں نے شیخ صاحب کی بے پناہ مقبولیت۔ غیر معمولی اثر و رسوخ اور ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو دیکھ کر محض سیاسی دوستی پر ہی اکتفا نہ کیا، انہوں نے شیخ صاحب کو اپنا ذاتی دوست بھی بنا لیا اور اس طرح جواہر لعل اور شیخ صاحب

کی دوستی نے کشمیر اور ہندوستان کے درمیان ایک نئی مفاہمت اور تعاون کا راستہ ہموار کر لیا۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں کا ہندوستان سے الحاق پر زور دینا اسی دوستی کا کرشمہ تھا۔ میں اس خیال سے اس حد تک متفق ہوں کہ اس دوستی نے بہت حد تک شیخ صاحب کی فکر اور اُن کی قوتِ فیصلہ کو متاثر کیا تھا۔ وہ بہت جذباتی، ذکی الحس اور خوددار آدمی ہیں۔ اور اسی لیے ضد اور انتہا پسندی اُن کے کردار کی نمایاں خصوصیت ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک جب وہ ہندوستان کے ساتھ معاشقہ لڑا رہے تھے تو کس کی مجال تھی کہ وہ ان کے محبوب کے متعلق حرف گیری کرتا۔ ۱۹۵۳ء میں جب یہ معاشقہ بدظنی، بدگمانی اور بے اعتباری کا شکار ہو کر دم توڑ گیا۔ تو اس کے بعد شیخ صاحب کی نظروں میں ہر وہ انسان مجرم اور غدّار ٹھہرا، کہ جو بھولے سے بھی ان کے محبوب سے اظہارِ الفت کرے، وہ میانہ روی کے قائل نہیں، محبت کرنے پر آئیں تو پھر انہیں کوئی برائی نظر نہیں آتی اور جب کسی سے نفرت کرنے لگ جائیں تو پھر اُس کی کسی خوبی پر نظر پڑنا محال ہے۔ سیاست میں اس قسم کی انتہا پسندی خطرناک ہوتی ہے اور خود شیخ صاحب کو اس سے بہت نقصان ہوا ہے لیکن وہ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کے قائل نہیں ہیں اور اسی لیے ہر ایک نئی غلطی کا ارتکاب کر کے اپنی پرانی غلطیوں کا جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی عوامی مقبولیت اور عقیدت کے پنگھوڑے میں گذری ہے۔ اور انہیں جائز طور پر اس بات کا احساس ہے، کہ وہ کشمیر کی سب سے مستند اور معتبر آواز ہیں۔ تاریخ کے ہر اہم موڑ پر کشمیری عوام ان کے احساس کو تقویت پہنچاتے رہے اور اس طرح ایک ایسا وقت بھی آن پہنچا کہ وہ اپنے آپ کو شیرِ کشمیر کی بجائے کشمیر سمجھنے لگے۔ ۱۹۴۶ء میں کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ اور ۱۹۴۷ء میں پاکستانی حملے کے

کے خلاف مزاحمت کا فیصلہ، دونوں ہی کا سہرا شیخ صاحب کے سر رہے گا، اور دونوں ہی فیصلوں نے شیخ صاحب کا اندازہ بہت حد تک صحیح ثابت کر دیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء کی تاریخ گواہ ہے، کہ اقتدار کے پنجرے میں رہ کر کشمیر کا شیر اپنی بہت سی خصوصیات کھو بیٹھا۔ اور اس طرح اس کی شہرت، عزت اور مقبولیت میں غیر معمولی کمی آگئی۔ شیخ صاحب کو اپنی زندگی میں غالباً پہلی بار اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کے نیچے کی زمین اتنی سخت اور پائیدار نہیں ہے جتنی بادی النظر میں دکھائی دیتی ہے۔ اقتدار کی سحر کاریوں نے انہیں کچھ دیر کے لیے اطمینان، آرام اور آسائش کا گرویدہ بنا لیا، اور دنیا یہ سمجھنے لگی کہ شیخ محمد عبداللہ اقتدار کے نشے میں بے خود ہو کر اپنی منزل سے دور بھٹک گئے۔ لیکن یہ اندیشہ عارضی ثابت ہوا۔ اور شیخ صاحب کو ہر ہر قدم پر ایک نامحسوس کمی کا احساس ستانے لگا، اسی احساس نے ۸ راگست کی رات اور ۹ راگست (۱۹۵۳ء) کی صبح کو جنم دیا۔ اور شیخ صاحب کو اپنی کھوئی ہوئی دولت دوبارہ مل گئی۔ پنجرے کا شیر زنجیریں توڑ کر ایک بار پھر دلوں پر حکومت کرنے لگا۔

شیخ محمد عبداللہ ایک کامیاب سیاستداں ہیں یا نہیں؟ اس پر دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ وہ ایک اچھے انسان ہیں یا نہیں؟ اس پر بھی بحث کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن ایک بات جس پر ان کے دوست دشمن سبھی متفق ہیں۔ وہ ہے اُن کی حب الوطنی۔ انہیں کشمیر سے بے پناہ عشق ہے۔ وہ کشمیر کی خاطر ساری دنیا کی بادشاہی کو بھی ٹھکرا سکتے ہیں۔ اور ان کی ساری زندگی اس عشق کی تفسیر ہے۔ یہ ان کی بہت سی کمزوریوں اور نامرادیوں کا منبع بھی ہے اور اُن کی بے پناہ قوت کا خزانہ بھی۔ ۱۹۳۱ء کی صبح سے لے کر ۱۹۶۹ء کی شام تک ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کیجیے، تو اندازہ ہو گا کہ ان کی ہر سانس کشمیر کے غم، اس کے دُکھ

درد اور اس کی خوشبو سے عبارت ہے اور یہی خصوصیت انہیں دیگر کشمیری رہنماؤں سے بلند اور ممتاز کر دیتی ہے۔ شیخ صاحب کی فتوحات کی فہرست مرتب کیجیے یا ان کی ناکامیوں کی تفصیلات، ہر عنوان کے تحت کشمیر سے اُن کی بے پناہ محبت اور عقیدت کا احوال مل جائے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کشمیری عوام نے ہمیشہ ان کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے ان کے خلوص اور نیک نیتی کا اعتراف کیا ہے۔
۱۹۴۷ء کے فیصلے اور ۱۹۵۳ء کے انقلاب میں بظاہر کوئی ہم آہنگی نہیں اور شیخ صاحب کے نکتہ چیں اکثر اس تضاد کے لیے انہیں ہدف ملامت بناتے آئے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس ظاہری تضاد میں ایک معنوی ہم آہنگی موجود ہے۔ کشمیر کے حسین اور خوشگوار مستقبل کا خواب ۱۹۴۷ء کے تاریخی فیصلہ کا جواز تھا۔ اور ۱۹۵۳ء کا انقلاب اسی خواب کے ٹوٹنے کا نتیجہ تھا۔ میں یہاں شیخ صاحب کی دانشمندی اور عاقبت اندیشی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ایک عاشق کی محبت اور مایوسی کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ ۱۹۵۳ء سے لے کر اب تک کتنے ہی ایسے مواقع آئے، کہ شیخ صاحب اپنی ضد چھوڑ کر وہ سب کچھ حاصل کر سکتے تھے، کہ جس کو حاصل کرنے کے لیے بہت سے لوگ اپنے ضمیر اور خودی کو بیچنے کے لیے ہر وقت تیار نظر آتے ہیں، لیکن وہ نتائج سے بے نیاز اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہے ہیں۔ کہ جو حقیقت کی سرحدوں سے دور___ بہت دور___ عالمی سیاست کے اس بھنور میں پھنس گئے ہیں کہ جہاں اس سے پہلے کئی خوابوں کے سفینے ڈوب چکے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے نامساعد اور ناموافق حالات کے سامنے ہتھیار ڈال کر فرار کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اور درگاہ شریف حضرت بل کی تعمیر نو کا "بہانہ" دراصل اس فرار کی تمہید ہے۔ بعض خوش فہموں کی رائے میں شیخ عبداللہ ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے ختم ہو گئے ہیں اور وہ آئندہ کشمیر کی تاریخ اور سیاست میں کوئی اہم

رول ادا نہیں کر سکتے۔ کچھ عرصے سے شیخ صاحب کی سیاست سے "بے تعلقی" اور اُن کی پُر اسرار خاموشی سے بظاہر ان شبہات کو تقویت ملتی ہے، لیکن جو لوگ ان کی سیاسی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ خاموشی ایک تجاہل عارفانہ ہے۔ اور یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی موت کے بعد بھی بہت دنوں زندہ رہیں گے۔ اور ان کا کشمیر کے سیاسی اُفق سے غروب ہونا اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس بات سے شاید شیخ صاحب خود بھی انکار نہ کر سکیں کہ کچھ عرصے سے انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ ان کے سامنے ایک واضح مقصد تو ہے، لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی واضح پروگرام نہیں ہے۔ وہ کچھ کھوئے ہوئے ہیں اور انہیں خود بھی معلوم نہیں کہ ان کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔ حالات نے اُن کے خلاف زبردست سازش کر رکھی ہے اور وہ اس اُلجھن میں گرفتار ہیں، کہ وقت کے پھیلائے ہوئے اس جال سے باہر کیسے آئیں۔ ان کی بے بسی پر رحم آتا ہے۔ اور ایک لمحے کے لیے ان سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ شیخ صاحب کی زندگی میں خطرناک موڑ آئے ہیں لیکن ان کی قیادت کو اتنے بڑے چیلنج کا سامنا اس سے پہلے کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ حالات کے اس بھنور سے کیسے باہر آتے ہیں، کہ جس میں عالمی سیاست کی لہریں ہر روز ایک نئی گرہ ڈال دیتی ہیں۔

شیخ محمد عبداللہ قد و قامت اور آن بان کے لحاظ سے مردانہ وجاہت اور وقار کا ایک مثالی نمونہ ہیں۔ ان کی آواز نے ان کی شخصیت کا جادو جگانے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اور شروع شروع میں لوگ اُن کی طرف اس لیے بھی متوجہ ہوئے کہ وہ لحنِ داؤدی کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں۔

ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم اور علامہ اقبال کی تصنیفات کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ پریم ناتھ بزاز کا کہنا ہے وہ کشمیر کی تاریخ سے بھی

ناآشنا ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ الزام کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن یہ بات قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شیخ صاحب کو مطالعے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ چودہ سالہ نظر بندی کے دوران انہوں نے کچھ کتابیں ضرور پڑھیں۔ لیکن یہ مطالعے کے شوق سے زیادہ نظر بندی کی مجبوریوں کا تقاضا تھا۔ ورنہ وہ اس قسم کی فضولیات میں اپنا وقت برباد کرنے کے قائل نہیں۔

شیخ صاحب بے حد جذباتی اور خوددار آدمی ہیں۔ اور اسی لیے اُن کی سیاست میں بھی عقلیت سے زیادہ جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ان کی خودداری نے انہیں بہت حد تک خود پسند اور خوشامد پسند بھی بنا دیا تھا۔ اور وہ اپنے ہر نکتہ چیں یا نقاد کو اپنا ذاتی دشمن سمجھتے تھے۔ لیکن طویل نظر بندی، حالات کی گردش اور غالباً تجربے نے ان کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ وہ آج بھی تنقید اور مخالفت میں فرق نہیں کر سکتے، لیکن اب اُن میں برداشت کی قوت پہلے سے زیادہ ہے۔ دراصل اُن کے مزاج اور کردار میں آمریت کا عنصر غالب ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معمولی سے معمولی حریف کو بھی زندہ رہنے کا حق دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے! اس آمرانہ رویے اور تنگ ظرفی نے شیخ صاحب کے لیے کئی مشکلات اور اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ ان میں چونکہ خود تنقیدی (SELF CRITICISM) کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لیے انہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔ شیخ صاحب کی ایک خصوصیت نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے اور وہ یہ کہ ایک اچھا مسلمان ہوتے ہوئے بھی زاہد خشک نہیں ہیں۔ انہیں زندگی اور اس کی رنگینیوں سے بے حد اُنس ہے۔ وہ اچھے کھانے، اچھے پہناوے، اور زندگی کی دوسری آسائشوں کے شوقین ہیں۔ اُنہیں پھول اُگانے کا شوق ہے اور وہ کسی خوبصورت عورت پر نظر

پڑتے ہی آنکھیں بند نہیں کرتے، وہ حُسن شناس بھی ہیں اور حسن پرست بھی ـــــ ان میں اگر کسی چیز کی کمی ہے، تو وہ ہے، (SENSE OF HUMOR) کی وہ کبھی کھل کر ہنس نہیں سکتے۔ اُن میں اُس شئے لطیف کی کمی ہے، جو صرف زندگی اور ادب کے گہرے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے وہ زندگی کے حُسن سے متاثر ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے کبڑے پن سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

میرزا محمد افضل بیگ

میرزا محمد افضل بیگ اپنی سیاست سے زیادہ غیر معمولی ذہانت، ذکاوت اور حاضر جوابی کے لیے مشہور ہیں۔ وہ کشمیر کے سیاسی مطلع پر اس وقت نمودار ہو گئے جب شیخ صاحب کی قیادت کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ طلوع ہو چکا تھا۔ بیگ صاحب کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے کبھی سورج بننے کی کوشش نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ آج ۵۰ سال بعد بھی اسی مرکز اور محور کے گرد گھوم رہے ہیں کہ جہاں سے انہوں نے پہلی بار روشنی پائی تھی۔ شیخ صاحب کے اولین ساتھیوں میں سے ایک میرزا افضل بیگ ہی ہیں، جو آج بھی رسم وفا نبھا رہے ہیں جبکہ ان کے اکثر ہم سفر اقتدار اور اعتقاد کی کشمکش میں اُن سے بچھڑ کر اب اُن کے حریف بن چکے ہیں۔ بیگ صاحب کی وفاداری ان کی ایمانداری کی علامت ہے، یا اُن کے سیاسی جمود کی، اس پر بحث کی گنجائش موجود ہے، لیکن یہ بات ان کی تعریف میں کہی جاسکتی ہے کہ بے مروّتی، احسان ناشناسی اور موقع پرستی کے اس دور میں انہوں نے غیر معمولی ایثار اور استقامت کا مظاہرہ کیا ہے۔!

میرزا افضل بیگ ۱۹۱۲ء میں اننت ناگ کے ایک معمولی کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد نظام الدین بیگ ایک معمولی ملازم تھے۔ بیگ صاحب کا بایاں ہاتھ پیدائش سے ہی ٹیڑھا تھا۔ اننت ناگ کے پسماندہ ماحول اور دیہاتی زندگی کی لاتعداد مجبوریوں کے باوجود اُن کا بی۔ اے پاس کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ بے پناہ قوتِ ارادی اور

خود اعتمادی کے مالک ہیں۔ ان کے ہم جماعتوں کا کہنا ہے کہ باوجود اس کے ان دنوں کالج میں شہری اور دیہاتی کے فرق پر بڑا زور دیا جاتا تھا اور دیہاتی طالب علم شہریوں سے کچھ دبے رہتے تھے۔ میرزا افضل بیگ نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے کالج بھر میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ وہ انگریزی کے اچھے مقرر تھے اور اکثر مباحثوں میں انعام حاصل کرتے تھے۔ کالج سے فارغ ہو کر کچھ عرصے کے لیے محکمہ جنگلات میں کلرک ہو گئے۔ لیکن کلرکی راس نہ آئی اور کچھ دنوں بعد ایل۔ ایل۔ بی۔ کرنے کے لیے علی گڑھ گئے۔ علی گڑھ میں خواجہ غلام محمد صادق، خواجہ غلام محمد چکن اور میرزا افضل بیگ ہم جماعت بھی تھے اور ہم نشین بھی۔ تینوں ممتاز ہوسٹل کے ایک کمرے میں رہتے تھے اور صادق صاحب کا کہنا ہے کہ بیگ صاحب نے علی گڑھ پہنچنے کے دوسرے ہی دن اس زور و شور سے پڑھائی شروع کر دی کہ ہم پریشان ہو گئے۔ وہ دن بھر مطالعہ کرتے رہتے اور اکثر ساری ساری رات جاگتے رہتے، بیگ صاحب کی اس محنت اور ریاضت کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے قانون کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور علی گڑھ سے فارغ ہو کر اننت ناگ میں وکالت شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیگ صاحب کی وکالت چمک اُٹھی، لیکن قدرت کو ان کی وکالت منظور نہ تھی۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے دوران ہی کشمیر کی سیاسی تحریک سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کئی بار شیخ صاحب کی تقریریں سننے کا موقع ملا تھا۔ اننت ناگ میں وکالت کے باوجود دوست احباب سے ملنے کے لیے اکثر سری نگر آیا کرتے تھے۔ ایک دن مائسمہ میں شیخ صاحب ہزاروں کے مجمع سے خطاب کر رہے تھے۔ سامعین میں میرزا افضل بیگ بھی تھے۔ اسی دن انہوں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ اور کشمیر کے سیاسی افق پر ایک اور ستارہ طلوع ہو گیا۔

بیگ صاحب اپنی سیاسی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور قوت استدلال کے سہارے جلد ہی قیادت کی اونچی صفوں میں جگہ پا گئے۔ شیخ صاحب ان کی قابلیت اور قانون

دانی سے بہت متاثر ہوئے۔ اور انہیں رفتہ رفتہ قانونی مشیر اور آئینی ماہر کا درجہ حاصل ہو گیا۔ ان دنوں صف اول کے سبھی لیڈروں کا تعلق شہر سری نگر سے تھا۔ میرزا بیگ پہلے دیہاتی تھے، جنہیں اس صف میں جگہ دی گئی۔ (مولانا مسعودی کی بات الگ ہے کہ وہ شہری دیہاتی کی ذیل میں نہیں آتے) اور یہ اس دیہاتی نوجوان کی غیر معمولی ذہانت اور خطابت کا ہی اعجاز تھا، کہ تحریک سفر میں جب کوئی نازک مقام آیا۔ شیخ صاحب نے اس کی رہنمائی کے لیے بیگ صاحب کو منتخب کیا۔ ۱۹۳۴ء میں نیشنل کانفرنس کی طرف سے پرجا سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں جب مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاستی کابینہ میں دو عوامی نمائندے لینے کا فیصلہ کیا، تو نیشنل کانفرنس کی طرف سے بیگ صاحب کو نامزد کیا گیا۔ پرجا سبھا کے ممبر اور بعد میں وزیر کی حیثیت سے بیگ صاحب نے اپنی قابلیت کی دھاک بٹھا دی اور تقریر کی گرم بازاری سے اپنے آپکو ایک بہت اچھا پارلیمنٹرین ثابت کر دیا۔ بعد میں نیشنل کانفرنس نے وزارت کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا، تو بیگ صاحب نے تنظیم کی ہدایت پر وزارت سے استعفیٰ دیا۔ ۱۹۴۶ء میں کوئٹ کشمیر کی تحریک شروع ہو گئی۔ اور بیگ صاحب گرفتار ہو گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا، اور جب بیگ صاحب اور ان کے دوسرے ساتھی رہا ہو گئے تو ہندوستان کا سیاسی نقشہ بدل چکا تھا۔ کشمیر کے سیاسی نقشے کے خدوخال ابھی پوری طرح واضح نہ ہوئے تھے۔ لیکن سیاسی مطلع پر بڑی تبدیلیوں کے بادل لہرا رہے تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں شیخ صاحب نے ایمرجینسی ایڈمنسٹریشن کا انتظام سنبھال لیا۔ تو بیگ صاحب ضلع اننت ناگ کے ایمرجینسی ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے اور جب مہاراجہ نے ایمرجینسی ایڈمنسٹریشن کے ناظم اعلیٰ کو وزیر اعظم مقرر کر دیا تو میرزا افضل بیگ مشیر مال مقرر ہوئے۔ ریاست میں انقلابی نوعیت کے زرعی اصطلاحات نافذ کرنے کا تاریخی کارنامہ انہی کی سرکردگی میں انجام دیا گیا۔ اس کے علاوہ مرکز کے ساتھ آئینی اور قانونی معاملات

طے کرنے میں وہ شیخ صاحب کے رفیق اور مشیر تھے اور ہر آئینی گتھی کو سلجھانے کے لیے بیگ صاحب ہی کا انتخاب ہوا کرتا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب شیخ صاحب اور بیگ صاحب دونوں ہی ہندوستان کے عشق میں گرفتار تھے۔

بیگ صاحب ہندوستان سے الحاق کو قرآن و احادیث کی روشنی میں صحیح ثابت کرنے کے لیے اپنا سارا زورِ استدلال صرف کر رہے تھے اور دیہاتیوں کی زبان اور اُنکے اپنے روزمرّے میں انہیں ہندوستان سے الحاق کی برکتوں کا وعظ سنایا کرتے تھے۔ ان کی جادو بیانی اور قانون دانی سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ یہ یقین کرنے لگ گئے کہ ہو نہ ہو ہندوستان سے الحاق کے نتیجے میں ان کی تقدیر ہمیشہ کے لیے سنور جائے۔ لیکن یہ طلسم زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ ۱۹۵۲ء میں دہلی اگریمنٹ کے فوراً بعد ہی شیخ صاحب کے ذہنی رویے اور ان کے طرزِ عمل میں ایک انقلاب رونما ہونا شروع ہو گیا۔ اور میرزا افضل بیگ کے لہجے میں اس بدلے ہوئے رویے کا اظہار ہونے لگا۔ مرکزی حکومت اور شیخ صاحب کے درمیان بے اعتمادی، بدظنی اور بیزاری کی علامتیں روز بروز واضح ہوتی گئیں۔ اور ۱۹۵۳ء کے وسط تک ریاستی لیڈرشپ باقاعدہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اس مرحلے پر میرزا افضل بیگ نے شیخ صاحب کا ساتھ دیا۔ اور انہوں نے کھل کر "بدلے ہوئے رویے" کی توضیح و تشریح کرنا شروع کر دی۔ جوں جوں ریاستی لیڈرشپ کے درمیان اختلافات اور تضادات کی آگ تیز ہوتی گئی۔ شیخ صاحب نے بیگ صاحب پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ اس سے قبل بخشی غلام محمد کو اُن کے معتمد خصوصی اور رفیق خاص کا درجہ حاصل تھا۔ اور شیخ صاحب نے میرزا افضل بیگ جیسے قابل اور دیانتدار آدمی کے ہوتے ہوئے بخشی صاحب کو اپنا نائب مقرر کیا تھا، لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی، بخشی صاحب نے کھل کر تو نہیں، لیکن اندر ہی اندر شیخ محمد عبداللہ کی جڑیں کاٹنا شروع کر دیں تھیں۔ اور شیخصاحب

کو میرزا افضل بیگ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ اگست ۱۹۵۳ء میں پوری کابینہ میں صرف وہی شیخ صاحب کے ساتھ تھے۔ ۹ اگست کو شیخ صاحب گرفتار ہوگئے تو کشمیری عوام نے ان کی ساری خطائیں معاف کر کے انہیں ایک بار پھر اپنی آنکھوں پر بٹھایا۔ اسی دن میرزا افضل بیگ بھی گرفتار ہوگئے اور اُن کے سارے گناہ بھی کشمیری عوام نے اپنے خون سے دھو دیے۔ اب شیخ صاحب اور ان کے درمیان کوئی رقیب نہ تھا اور ہر جگہ ان کا نام شیخ صاحب ہی کے ساتھ لیا جانے لگا۔ ۱۹۵۵ء میں اُنھیں کچھ مدت کے لیے رہا کیا گیا۔ اور انہوں نے آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں ایک زوردار تقریر کر کے تاریخ کے بہاؤ کو بدلنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی انہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے پھیلائے ہوئے جال میں کچھ اس طرح پھنس گئے ہیں کہ جادو بیانی اور بذلہ سنجی کے سہارے وہ اس سے باہر نہیں آسکتے۔ بیگ صاحب کی دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا کہ جدوجہد کا راستہ طویل بھی ہے اور دشوار گذار بھی۔ اس لیے انہوں نے محاذِ رائے شماری کے نام سے ایک نئی سیاسی تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ اور وہ آج بھی اس جماعت کے صدر اور سربراہ ہیں!

۱۹۵۸ء میں کشمیر سازش کیس کے نام سے شیخ صاحب، بیگ صاحب اور اُن کے متعدد ساتھیوں کے خلاف پاکستان کے ساتھ ساز باز کرنے کے الزام میں ایک مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمے میں ملزموں کی طرف سے کئی چوٹی کے وکیلوں کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن دفاع کی اصل ذمہ داری میرزا بیگ ہی کے کندھوں پر تھی۔ اِس مقدمے کے دوران انہیں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے مسٹر پاٹھک (موجودہ نائب صدر) اور شہرۂ آفاق وکیل مسٹر ڈنگل فٹ سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔ بیگ صاحب کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور زندہ دلی نے عدالت کی ساری فضا کو متاثر کیا تھا اور خود فاضل جج نے کئی بار ان کی نکتہ شناسی اور معنی آفرینی کی داد دی۔

میرزا افضل بیگ صرف وکیل ہوتے، تو آج اُن کا شمار ہندوستان کے بہترین وکیلوں میں ہوتا، لیکن انہیں کبھی جم کر وکالت کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس لیے وسیع قانونی مطالعہ اور بہترین صلاحیتوں کے باوجود انہیں وکیلوں کی صف میں نہیں رکھا جاسکتا۔ سیاسی میدان میں انہیں اُن سے کم تر درجے کی صلاحیت رکھنے والوں نے پچھاڑا ہے اور اپنی بے پناہ ذہانت کے باوجود اپنے حریفوں سے مات کھائی ہے۔ وہ وکالت میں سیاست اور سیاست میں وکالت کے نسخے آزما کر اپنے دوستوں کو متاثر اور دشمنوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس جادوگری سے ان کے دشمنوں میں اضافہ اور ان کے دوستوں میں کمی واقع ہوئی ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ بیگ صاحب کو اس کا احساس اور اندازہ نہیں ہے۔

بیگ صاحب بے حد ظریف، حاضر جواب، زندہ دل اور مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ انہیں اس تیزی کے ساتھ فقرہ سوجھتا ہے، کہ دشمن کو وار کرنے کا تو کیا، وار سنبھالنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان کی حاضر جوابی اور ظرافت کے قصّے زبانِ زد عام ہیں اور بیگ صاحب بُرا نہ مانیں، تو میں کہوں گا، کہ ان کی سیاست کے متعلق لوگوں کو زیادہ معلوم بھی نہیں۔ وہ شیخ صاحب کے وکیل ہیں اور ان کی ہر بات کی وکالت کرتے ہیں۔ اگر شیخ صاحب نے ۱۹۵۳ء میں ہندوستان کے تئیں اپنا رویہ اور نظریہ تبدیل نہ کیا ہوتا، تو بیگ صاحب آج محاذِ رائے شماری کی صدارت کی بجائے منصبِ وزارت پر فائز ہوتے۔ شیخ صاحب آج اپنا موقف بدل لیں تو دوسرے دن بیگ صاحب اس موقف کی وکالت میں استدلال اور منطق کے دریا بہانے شروع کر دیں گے۔ ان کی سیاست شیخ صاحب کی سیاست کا پاکٹ ایڈیشن ہے اور وہ اپنے اس رول سے مطمئن ہیں۔ بیگ صاحب کی اس "بندہ نوازی" میں خود ان کے اپنے سیاسی نظریات اور عقائد کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے سنجیدگی سے کسی

نظامِ فکر کو قبول نہیں کیا ہے۔ ان کی لطیفہ گوئی کی عادت نے اُن کی شخصیت اور فکر کو بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ وہ ہر اہم مسئلہ کو لطیفوں کے ذریعے سمجھا کر چٹکیوں کی مدد سے حل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مذاق کبھی کبھی شائستگی کی سطح سے گر کر ابتذال اور فحاشی کی حدوں کو چھوتا ہے۔ ان کی ظرافت اور لطیفہ گوئی میں اکثر جنسی پہلو غالب ہوتا ہے۔ جب ظرافت ایک خوشگوار ادا کی بجائے کردار کی نمایاں خصوصیت بن جائے تو یہ انسان کی فکر اور اس کے مزاج پر مکمل غلبہ پا لیتی ہے۔ بیگ صاحب کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ میرزا صاحب ایک بہت اچھے دوست، رفیق اور ہم سفر ہیں۔ جن دوستوں نے بیگ صاحب کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ نہایت ہی ہمدرد، مخلص اور بے ریا ساتھی ہیں۔ وہ اپنے دوست احباب کے ہر دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور خاص طور پر بیماروں کے لیے بیگ صاحب سے بہتر تیماردار ملنا مشکل ہے۔ لیکن سیاسی میدان میں انہیں اپنے بہترین دوستوں کی رقابت بھی گوارا نہیں اور غالباً اسی لیے محاذِ رائے شماری کے بہت سے کارکن صرف اس جرم کی پاداش میں نکال باہر کیے گئے ہیں کہ وہ کبھی کبھی کن انکھیوں سے بیگ صاحب کو گھورا کرتے تھے!

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

مولانا مسعودی

موئے مقدس کی تحریک کے دوران تین نعروں نے جنم لیا۔ سازش کو ننگا کرو، اصلی مجرم کو پیش کرو اور مولانا مسعودی زندہ باد۔ "موسم" کی خرابی کی وجہ سے سازش کو ننگا کرنے کی بجائے اُسے کپڑے پہنا دیئے گئے ہیں۔ اصلی مجرم کو پیش کرنے کی بجائے نقلی مجرموں کو بھی رہا کر دیا گیا ہے اور مولانا مسعودی زندہ باد ہونے کی بجائے ایک سوالیہ علامت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اصلی مجرم کا نام تو ابھی تک زبان زدِ خلائق ہے۔ لیکن مولانا ایک افسانوی کردار ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ خود گوشہ نشین ہو گئے ہیں یا حالات کی سازش نے انہیں خلوت نشینی پر مجبور کر دیا ہے؟ ایک ایسا سوال ہے، جس کا جواب مولانا کے پاس ضرور ہو گا۔ لیکن چونکہ وہ جواب دینے کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے یہ سوال لاجواب رہے گا!

میں نے بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ موئے مقدس کی تحریک مولانا کے ذہن کی پیداوار تھی۔ یہ صرف آدھی حقیقت ہے، پوری حقیقت یہ ہے کہ موئے مقدس کی گمشدگی کے بعد ایک طوفان آیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور وہ لاوا، جو پورے سترہ برس ذہنوں میں پلتا رہا۔ اتنی شدّت کے ساتھ پھوٹ پڑا کہ چاروں طرف شعلے ہی شعلے نظر آنے لگے۔ یہ آگ ہمیں بھسم کر سکتی تھی، یہ طوفان ہمیں تباہ کر سکتا تھا لیکن مولانا نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر اس طوفان کے لیے ایک راستہ معیّن کر دیا۔

اس آگ کی آنچ سے جذبات کو گرم رکھا۔ لیکن ہمارے جسم کو جلنے سے بچایا۔ مولانا کی زندگی کے تجربے نے ایک اہم منزل پر قوم کی رہنمائی کی۔ اس طرح موئے مقدس کی گم شدگی سے پیدا شدہ ہنگامے کو تحریک بنا دینے میں مولانا کے ذہن سے زیادہ اُن کی ذہانت کو دخل ہے۔ تحریک موئے مقدس کے دوران جس کسی نے مولانا کو لاکھوں کے مجمع سے گھنٹوں خطاب کرتے دیکھا ہے وہ اس وقت حیران ہوتا تھا کہ یہ آدمی پچھلے گیارہ برسوں میں کہاں تھا، وہ آج بھی حیران ہو رہا ہے کہ وہ آدمی جس کی گرم گفتاری اور نرم روی نے طوفان کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ آج کہاں ہے؟ مولانا کو جاننے والوں کے لیے ان کی یہ "گم شدگی" زیادہ پُراسرار نہیں، یہ مولانا کے مزاج، ان کی افتادِ طبع اور اُن کے کردار کی ایک خصوصیت رہی ہے۔

تحریک حریت کے دوران مولانا نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اپنے تبحرِ علمی اور متانت کی وجہ سے انہیں وہ قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا، جو اُن کے پائے کے دوسرے رہنماؤں کو نصیب ہوا۔ کشمیری زبان پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بھی وہ عوام کے بہت قریب نہ آسکے، لیکن تنظیمی سطح پر وہ ایک طاقت ور اور بارسوخ جنرل سیکریٹری تھے نیشنل کانفرنس کی تحریک کو ایک فکری اساس دینے میں مولانا کا بہت بڑا حصّہ ہے آزادی کے بعد جب دیگر رہنما اقتدار کی زلفوں کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ مولانا مجاہد منزل میں نیشنل کانفرنس کی زلفوں کے پیچ و خم کو سنوارنے کی سعی کرتے رہے۔ اُن کی زندگی کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا لباس، رہن سہن، خورد و نوش سب ایک ڈگر پر قائم رہے۔ ان دنوں نیشنل کانفرنس اقتدار کا سرچشمہ نہ سہی، لیکن طاقت کی ایک بہت بڑی علامت تھی۔

۱۹۵۳ء کے انقلاب میں مولانا کا کیا رول تھا۔ آئینہ ساز کو اس کے بارے میں ذاتی طور پر کچھ معلوم نہیں، لیکن دسمبر ۱۹۶۳ء میں جموں جیل میں شیخ صاحب نے آئینہ ساز کو بتایا تھا کہ مولانا ان کے ہم خیال نہ تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے شیخ صاحب

کے مخالفین کا ساتھ نہیں دیا۔ شیخ صاحب کے ساتھ اس نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ اُن کے مؤید، مونس اور غم خوار بنے رہے۔ (بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں مولانا سے زیادہ شری ڈی، پی، در کا دخل ہے) پھر رفتہ رفتہ مولانا سیاسی مطلع سے ہٹ گئے۔ حالات نے پھر سازش کر کے انہیں خلوت نشینی پر اُکسایا اور مولانا حالات کے بہکاوے میں آکر اپنی شخصیت کے خیمے میں پناہ گزین ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء میں بخشی غلام محمد نے انہیں حضرت بل کے مقدمۂ قتل میں ماخوذ کر کے ایک بار پھر گوشہ نشینی ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ عدالت میں مولانا کا بیان اس دور کی تاریخ بھی ہے اور تفسیر بھی۔ یہ صفائی کا بیان نہیں بلکہ مُدعیان کے خلاف اس دور کا فردِ جرم ہے۔ ناسازیٔ صحت اور شری جواہر لال نہرو کی مداخلت کی وجہ سے اُن کے خلاف مقدمۂ قتل واپس لیا گیا اور وہ پھر "روپوش" ہو گئے۔ کبھی کبھی شہر کی شاہراہوں پر کالی داڑھی، کالی شیروانی اور کالی ٹوپی میں ملبوس ایک مضمحل اور پژمردہ شخصیت کمر جھکائے نظر آتی۔ عہدِ رفتہ کی یادگار، اپنی شکست کا مزار اور اپنی ذہانت کی شہید!

پھر موئے مقدس کو اپنی جائے پاک سے ہٹایا گیا اور مولانا ایک بار پھر اپنی کمین گاہ سے نکل آئے۔ اب کی بار ان کا آنا قیامت کا آنا تھا، زبان کا اختلاف حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ فصیح و بلیغ اردو میں مولانا نے ان پڑھ دیہاتیوں، جاہل کسانوں اور گنواروں کو بغاوت اور انقلاب کے رمز بتائے۔ ان کے چہروں سے مولانا نے اس طوفان اور تلاطم کا اندازہ کر لیا، جو تاریخ کی آغوش میں پل کر اب ساری کائنات کو لپیٹ میں لینے کے لیے بے تاب تھا۔ مولانا کی دور بین نگاہوں نے "گوہرِ مقصود" کو پا لیا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار انہیں قبول عام حاصل ہوا۔ وہ اپنی عظمت اور ذہنی نفاست کی بلندیوں سے اتر کر عوام کی آغوش میں آ گئے تھے۔ لیکن بہت دیر تک انہیں یہ فضائیں راس نہ آسکیں۔ وہ پھر اپنی منزل کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ دریائے سندھ کے

کے کنارے گاندربل میں انہوں نے اپنے اردگرد پھر ایک خندق کھود لی ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے خیمے میں ایک بار پھر پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔ مولانا نے اپنی ذات کو ایک اسرار بنا دیا ہے۔ وہ کبھی اپنی بلند سطح سے نیچے آنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ نظریاتی اعتبار سے بڑے ترقی پسند اور روشن خیال واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے نظریات صرف انہیں تک محدود ہیں۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی تک قطعیت ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہندوستانی ہیں یا پاکستانی۔ وہ محاذ رائے شماری کے رکن ہیں یا عوامی ایکشن کمیٹی کے خیر خواہ وہ اپنے تدبر، ذہانت، بصیرت، حکمت عملی سے بہت کام لے سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں بت تراشی میں صرف کی ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی شخصیتوں کے قدم آدم بت تراش کر ان کے سائے میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ وہ گفتار کے غازی ہیں، لیکن اُن کی خاموشی کے سامنے ان کی تقریر بھی شرمندہ ہے، ان میں ضرورت سے زیادہ ضبط اور توازن ہے۔ اسی میں اُن کی عظمت بھی ہے اور شکست بھی!

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

خواجہ غلام محمدؒ صادق

صادق صاحب کا اصلی نام غلام محمد ہے اور وہ خاندانی اعتبار سے خواجہ ہیں لیکن آپ خواجہ غلام محمد کہہ کر ان کی نشان دہی نہیں کر سکتے ہیں۔ دنیا انہیں صادق صاحب کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اور وہ خود اپنے خواجہ ہونے پر اصرار نہیں کرتے، صادق اُن کا تخلص معلوم ہوتا ہے اور تخلص کی نسبت سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی شاعر رہے ہوں گے، تلاشِ بسیار کے بعد بھی مجھے ان کا نمونۂ کلام دستیاب نہیں ہو سکا، البتہ اُن کے والد کے متعلق یہ سننے میں آیا ہے کہ فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ خود صادق صاحب بھی اُردو اور فارسی شاعری کا عمدہ مذاق رکھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعری سے لگاؤ کی بناء پر اپنے نام کے ساتھ ایک تخلص جوڑ دیا اور ایک شعر کہے بغیر اسی تخلص سے مشہور ہو گئے۔

خواجگی سے ترقی پسندی تک کا سفر بہت طویل، پیچدار اور دشوار ہے۔ لیکن صادق صاحب نے اسے ایک ہی جست میں طے کر دیا۔ وہ ۱۹۱۲ء میں بٹہ مالو کے ایک متمول، صاحبِ ثروت اور اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے، اِن کے والد سخت قسم کے اہلِ حدیث تھے، اور گھریلو ماحول پر مذہبیت کا گہرا اثر تھا۔ لیکن صادق صاحب شروع سے ہی "بُری صحبت" میں پڑ گئے، اور باوجود صد احتیاط کے ان کی ملاقات کچھ ایسے کافروں سے بھی ہو گئی جو ایمان اور اندھے یقین کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں۔ کالج میں "بُری صحبت" کے اور زیادہ مواقع مل گئے اور رفتہ رفتہ شہر کا

یہ رئیس زادہ مذہبی کٹرپن کے اثر سے آزاد ہو کر خطرناک قسم کی باتیں سوچنے لگا۔ اُنہی دنوں اس نے کچھ ایسی کتابیں پڑھ ڈالیں کہ جن سے متاثر ہو کر یہ اہلِ حدیث نوجوان اپنے آبا و اجداد کی راہ سے ہٹ کر مارکس، انجیلز اور کمیونزم کا گرویدہ ہو گیا۔ ان دنوں کمیونزم سے دلچسپی رکھنا سیاسی اور سماجی طور خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن صادق صاحب کے ذہن میں ایک انقلاب رونما ہو چکا تھا اور وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ علی گڑھ نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر کے انہوں نے پریکٹس شروع کر دی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگے، ان دنوں وہ سیاسی جلسوں میں حفیظ جالندھری کا کلام مترنم آواز میں پڑھ کر لوگوں کا لہو گرمایا کرتے تھے۔ یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے، ۱۹۳۴ء میں وہ پرجا سبھا اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے اور اس طرح خواجہ غلام محمد صادق سیاسی تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہو گئے اسیاسی زندگی کی اتھل پتھل اور ذہنی انقلاب کے تلاطم میں بھی صادق صاحب نے وضع داری، رکھ رکھاؤ اور شائستگی کے روایتی انداز ترک نہیں کیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاندانی روایات کی زنجیریں توڑنے کے باوجود اُن سے مکمل طور پر کبھی بھی آزاد نہیں ہوئے۔ اس کا انہیں فائدہ بھی ہوا ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ کہ اُنہیں اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں ہی وہ عزّت و توقیر اور منصب حاصل ہو گیا کہ جس کے لیے بخشی غلام محمد اور اس قبیل کے دوسرے رہنماؤں کو غیر معمولی جدوجہد کرنی پڑی۔ تحریک آزادی کے سرکردہ رہنماؤں میں سے وہ غالباً سب سے کم مدّت کے لیے جیل گئے رہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اہم اور تاریخی منصبوں پر فائز رہے ہیں۔ ان کی کم آمیزی، سنجیدگی اور لیے دیے رہنے کی عادت نے انہیں نوجوانی میں ہی بزرگ بنا دیا۔ لیکن اس سے نقصان یہ ہوا کہ صادق صاحب کبھی عوام سے براہِ راست تعلق پیدا نہ کر سکے۔ وہ عوامی زندگی کے آداب، اس کے

تقاضوں اور اس کے زیروبم سے ہمیشہ ناآشنا رہے۔ انہیں لوگوں کی عزت تو حاصل ہوگئی۔ لیکن وہ اُن کی محبت سے محروم رہ گئے۔ عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے عقیدے کی بلندیوں سے نیچے آکر کبھی کبھی ذہن اور ضمیر کے ساتھ ناانصافیاں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ صادق صاحب نے ان بلندیوں سے نیچے آنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ اس بے نیازی بلکہ سرد مہری کے لیے انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے باوجود وہ آج بھی اپنی روش بدلنے کے لیے تیار نہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تحریک حریت کے گذشتہ ۳۸ سال میں جب بھی کوئی تاریخی مرحلہ آیا۔ صادق صاحب کا نام کسی نہ کسی طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ ۱۹۳۹ء میں پاکستانی لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لیے شیخ صاحب نے صادق صاحب کو ہی لاہور بھیجا اور ۱۹۴۵ء کے بعد مختلف وزارتی عہدوں پر فائز رہ کر جب ۱۹۵۱ء میں آئین ساز اسمبلی قائم ہوئی تو اسمبلی کی صدارت کے اہم منصب کے لیے شیخ صاحب نے صادق صاحب ہی کا نام تجویز کیا۔ (حالانکہ ان دنوں شیخ صاحب اور صادق صاحب کے درمیان نظریاتی اختلافات نمودار ہونے لگے تھے) اور صادق صاحب کچھ عرصہ سے وزارت سے الگ ہو چکے تھے)۔

اس طرح ریاست جموں وکشمیر کا موجودہ آئین بھی انہی کی صدارت میں مکمل ہوا اور ۱۹۶۵ء میں نیشنل کانفرنس کو نیشنل کانگریس میں مدغم کرنے کا فیصلہ بھی صادق صاحب ہی کی قیادت میں ہوا غرض ہر تاریخی فیصلے کے ساتھ صادق صاحب کی ذات اور ان کا نام وابستہ ہے اور اس طرح اُنہیں کشمیر کی تاریخ میں ہمیشہ ایک اہم مقام حاصل رہے گا۔ کشمیر کی سیاسی قیادت میں ذہنی فکری اور نظریاتی دیانت داری کو کبھی زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی ہے، لیکن یہ بات صادق صاحب کے حق میں کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ذاتی دیانت داری کے ساتھ ساتھ ذہنی اور

فکری سطح پر بھی عقائد اور اصولوں کے ساتھ گہری وابستگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے کسی اصول یا سوال پر جب بھی اختلافات کیا، تو سود وزیاں کی پروا کیے بغیر اس کا اظہار بھی کیا۔ شیخ صاحب کے دوران اقتدار میں ان سے کسی بات پر اختلاف کرنا آسان نہ تھا، لیکن صادق صاحب ان دنوں بھی اپنی بات کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا، کہ انہیں عملی طور پر نیشنل کانفرنس سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ خود شیخ صاحب نے مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ ۱۹۵۳ء کے نظریاتی تلاطم میں اگر میرے کسی ساتھی نے کھل کر مجھ سے اختلاف کیا، تو وہ غلام محمد صادق تھے۔ بخشی صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ تو صادق صاحب نے بخشی صاحب کے طور طریقوں سے ناپسندیدگی کا اظہار کر کے اپنی سیاسی آوارہ گردی کا اہتمام کر لیا۔ انہوں نے ریاستی کابینہ میں شمولیت کی دعوت کو ٹھکرا کر ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے نام سے پہلی بار بخشی صاحب کے خلاف ایک ترقی پسند اپوزیشن قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں ان کے ساتھ ڈی، پی در جیسے موقع پرست اور سید میر قاسم جیسے خود پسند ساتھی بھی شامل تھے، کہ جن کے پاؤں جدوجہد کے پرُخار راستے پر قدم رکھتے ہی لہولہان ہو گئے۔ اس لیے صادق صاحب نے صرف اڑھائی سال کے بعد ہتھیار ڈال دئے اور اس طرح ریاست میں ایک ترقی پسند جمہوری اپوزیشن کا پہلا تجربہ ناکام ہو گیا۔ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں مدغم کرنے کا فیصلہ صادق صاحب کی سیاسی زندگی کا سب سے ناخوشگوار اور تکلیف دہ باب ہے اور اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے، کہ اقتدار سے ایک بار وابستہ ہونے کے بعد، پھر اس سے الگ ہو جانا کتنا مشکل اور کارِ دارد والا معاملہ ہوتا ہے۔ انسان کسی نہ کسی بہانے سے کھوئی ہوئی جنت کی بازیافت کے لیے کوشاں رہتا ہے!

۱۹۶۳ء میں کامراج پلان کے تحت بخشی غلام محمد کے استعفیٰ کے بعد صادق صاحب

وزیراعظم ہوتے ہوتے رہ گئے۔ جواہر لال نہرو سے لے کر جواہر لال مام راسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر آنک ہر شخص کو اس بات کا یقین تھا کہ بخشی صاحب کے بعد وہی اُن کے جانشین ہوں گے۔ خود صادق صاحب کو بھی اپنے وزیراعظم ہونے کا یقین تھا، لیکن اس کے باوجود ایسا نہ ہوا، ان کی جگہ ایک اور خواجہ (شمس الدین) وزیراعظم ہو گئے۔ موئے مقدس کی گُم شُدگی کا سانحہ درپیش نہ آتا، تو کون جانتا ہے کہ صادق صاحب کو وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہونے کا موقع ملتا بھی یا نہیں۔ اس لحاظ سے صادق صاحب کو وزیراعظم بنانے میں ان کی اپنی صلاحیتوں سے زیادہ موئے مقدّس کی کرامت کا دخل ہے۔ لیکن ایک بار وزیراعلیٰ ہونے کے بعد صادق صاحب نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وہ اتنے بے عمل، بے ضرر اور بھولے نہیں ہیں، جتنے وہ بادی النظر میں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ آج بھی اصول، اخلاق، آداب اور اقدار کی باتیں کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن اب اصول اور اخلاق کی تعریف کچھ بدل سی گئی ہے۔ اقتدار کے تحفظ اور تسلسل کی خواہش نے اقدار کے معنی بھی بدل دیئے ہیں۔

ایک لبرل وسیع القلب اور شائستہ سیاستداں کی حیثیت سے ان کی بہت سی صلاحیتیں نکھر آئی ہیں۔ لیکن بحیثیت ایڈمنسٹریٹر کے ان کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ سیاسی میدان میں انہوں نے اپنے حریفوں کو ہر ہر قدم پر ناکوں چنے چبوائے، لیکن میدان جنگ کی ہر فتح نے انہیں اپنی شکست سے قریب تر کر دیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنی "فتوحات" کی دیکھ بھال کا سلیقہ نہیں آتا۔ ایک ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے انہوں نے جس تساہل، تغافل اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے انتظامیہ میں کورپشن، بدنظمی، بددیانتی اور بے راہ روی کو غیر معمولی فروغ دیا ہے۔ اس طرح صادق صاحب نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بے عمل آدمی کے لیے شرافت، شائستگی اور روشن دماغی پاؤں کی زنجیر بھی بن سکتی ہے۔ انکی جن صلاحیتوں نے سیاسی زندگی میں انہیں عزت اور وقار بخشا تھا۔ انتظامیہ میں انکی رسوائی اور بدنامی کا باعث

بن گئی ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ کہ صادق صاحب سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی بے بس ہیں۔ اور یہی اُن کی زندگی کا المیہ ہے۔

انہیں پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق ہے اور میرا خیال ہے کہ کشمیر کے سبھی سیاسی لیڈروں میں وہ غالباً سب سے زیادہ پڑھے لکھے لیڈر ہیں، لیکن ان کا مطالعہ صرف کتاب تک موقوف ہے۔ انسانی نفسیات کی گہرائیوں اور ذہن کی پیچیدگیوں کو انہوں نے شاید کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بہترین ساتھیوں کو بھی زیادہ دور تک اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔

صادق صاحب کے قریب ترین ساتھیوں کا کہنا ہے کہ وہ بے حد شریف یا اخلاق، باوضع اور بھلے مانس آدمی ہیں، لیکن شفقت، مروّت اور محبت کے جذبات سے عاری۔ صادق صاحب کا کہنا ہے کہ میں اداکاری اور ظاہرداری کا قائل نہیں ہوں۔ اسی لیے اپنے جذبات کی نمائش نہیں کرتا۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ صادق صاحب کی شخصیت میں وہ آنچ نہیں جو دوستی اور محبت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اور اسی لیے ان کی محبت اور دوستی پر بھی ظاہرداری کا گمان ہوتا ہے۔

بے نیازی ان کی عادت نہیں، فطرت ہے۔ اور انسانی تعلقات کے پیچیدہ نظام میں جب تک دونوں طرف برابری کی آگ نہ لگی ہو۔ روشنی پیدا نہیں ہوسکتی۔ صادق صاحب کی اس سردمہری نے ان کے بہت سے رفیقوں کو ان سے چھین لیا ہے اور جو ابھی تک ان کی دوستی اور رفاقت کا دم بھر رہے ہیں وہ بھی غالبؔ کا یہ شعر گنگناتے ہوئے نظر آرہے ہیں ؎

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

صادق صاحب کی ایک اور بدقسمتی یہ ہے کہ ان کا مقابلہ اکثر ان کے پیشرؤوں سے

سے کیا جاتا ہے، وہ بخشی غلام محمد کے مقابلے میں زیادہ مہذّب، تعلیم یافتہ اور شائستہ آدمی ہیں، لیکن بخشی صاحب ان کے مقابلے میں زیادہ باعقل اور حقیقت پسند تھے۔ صادق صاحب قاعدے، ضابطے کے آدمی ہیں۔ عام طور پر کوئی خلاف قاعدہ بات نہیں کرتے۔ بخشی صاحب کی ذات خود ایک قاعدہ، ایک ضابطہ تھی اور انہیں، کسی ضابطے کی پرواہ نہیں تھی، بخشی صاحب بڑے فراخدل اور سخی قسم کے انسان تھے اور اُس کے مقابلے میں صادق صاحب بڑے کنجوس قسم کے آدمی ہیں۔

بخشی صاحب کے دور میں کوئی شخص بخشی خاندان کے کسی ذاتی ملازم کی طرف بھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا اور صادق صاحب کے دور میں خود اُن کی ذات تنقید، تنقیص اور ملامت کا نشانہ بنائی جاتی ہے۔ بخشی صاحب کے وقت میں شیخ صاحب یا اُن کے ساتھیوں کا جیل سے باہر رہ کر سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا — صادق صاحب کے دور میں شیخ صاحب اور اُن کے ساتھی آزاد ہی نہیں، بقول سید میر قاسم ضرورت سے زیادہ آزاد ہیں۔ بخشی غلام محمد دشمنوں کو دوست بنانے کا طریقہ جانتے تھے۔ صادق صاحب دوستوں کو دشمن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے — بخشی صاحب کو ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے بڑی دلچسپی تھی اور ان کے دور میں ثقافتی سرگرمیوں کو کافی بڑھاوا ملا۔ انہیں موسیقی سے شغف تھا اور وہ کسی نہ کسی بہانے رقص و سرور کی محفل سجا لیتے، صادق صاحب شعر و ادب اور مصوّری کا بہت ستھرا مذاق رکھنے کے باوجود کبھی کسی تمدنی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے۔ بخشی غلام محمد کا حافظہ اس قدر تیز تھا، کہ انہیں سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں کے نام یاد تھے اور وہ اپنے ہر ملنے والے کو اس کے اصلی نام سے پکارا کرتے تھے۔ صادق صاحب کے متعلق یہ مشہور ہے کہ انہیں اپنے قریب ترین ساتھیوں کے نام بھی بھول جاتے ہیں! ان کے کمزور حافظے کے متعلق عوام و خواص میں بہت سے لطیفے مشہور ہیں لیکن میرا اپنا تجربہ یہ ہے، کہ کمزور حافظے کا "افسانہ" خود ان کی تخلیق ہے اور

انہوں نے جان بوجھ کر اس کی تشہیر کی ہے۔

صادق صاحب بڑے نفاست پسند، خوش پوش اور خوش مذاق آدمی ہیں۔ وہ بذلہ سنج بھی ہیں اور حاضر جواب بھی، لیکن اس اعتدال کے ساتھ کہ کبھی سنجیدگی اور توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ میرزا افضل بیگ مذاق کر سکتے ہیں۔ مذاق برداشت نہیں کر سکتے۔ صادق صاحب چوٹ کرتے بھی ہیں اور چوٹ سہتے بھی ہیں۔

صادق صاحب کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے اُن کی اخلاقی جرأت، وہ مصلحتوں کی پروا کیے بغیر اپنے موقف پر قائم رہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اس بات کے لیے وہ تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ سستی شہرت اور مقبولیت کی خاطر اپنے نظریات کو قربان نہیں کرتے۔ ہندوستان سے اُن کی وفاداری ایک نظریاتی اور اصولی وابستگی ہے اور جب کسی اہم سوال پر مرکزی لیڈرشپ سے ٹکر لینے کا سوال پیدا ہوا ہے تو صادق صاحب نے بڑی جرأت اور ہمت کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے قبول عام حاصل کرنے کے لیے کبھی کوئی ایسی رعایت نہیں دی ہے، جو اصولی طور پر غلط ہو!

صادق صاحب کی ذات ایک معمّہ ہے اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے، کہ میں ابھی تک اس معمّے کو حل نہیں کر سکا ہوں۔ وہ اتنے شریف اور بھلے مانس ہیں کہ بعض اوقات اُن کے سیاست داں ہونے پر بھی شبہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اتنے تجربہ کار سیاست داں ثابت ہوئے ہیں کہ ان کی شرافت اور بھلمنساہٹ بھی مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی سادگی میں وہ پُرکاری ہے کہ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ درگا پرشاد در نے شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد جیسے کھلاڑیوں کو بھی مات دی، لیکن صادق صاحب نے جس خوبصورتی اور صناعی کے ساتھ اُسے سیاسی میدان سے ایل۔بی۔ ڈبلیو کر دیا۔ ہے، وہ کچھ ان ہی کا حصّہ ہے۔ وہ تن تنہا شیخ صاحب، بخشی صاحب اور سید میر قاسم

کے ساتھ لڑ رہے ہیں اور ابھی تک ان تینوں حریفوں کے مقابلے میں ان ہی کا پلڑا بھاری ہے۔ سیاسی جوتشی اس عجیب الخلقت سیاسی لیڈر کے کردار کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں!

(سالنامہ اکتوبر ۱۹٦۹ء)

مولانا فاروق صاحبؔ

کبھی کبھی کسی اچانک جھٹکے سے عورت کی ہی طرح تاریخ کا اسقاطِ حمل بھی ہوجاتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں کشمیر کی تاریخ نے، جسے بخشی غلام محمد نے دس سال تک زر اور زور کی معجونِ مُرکب کھلا کھلا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ موئے مبارک کے ہنگامۂ نشوریں ہڑبڑا کر انگڑائی لی اور اس کے رحم میں پلنے والے عجیب الخلقت بچے کو وقت سے کچھ پہلے ہی پیدائش کا مرحلہ طے کرنا پڑا۔ مولینا فاروق کا سیاسی طلوع اس غیر معمولی وضع حمل کا ایک کرشمہ ہے۔ عام طور پر ایسے نوزاد باہر کی لو لگتے ہی عدم کو سدھار جاتے ہیں، لیکن فاروق صاحب کی سیاسی بالیدگی حیران کُن حد تک تیز اور صحت آور ہے۔ اس حیرتناک بقار کے لیے کچھ تو اس وجود میں چھپی ہوئی توانائی ذمہ دار ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم بات کشمیر کے وہ سیاسی تضادات ہیں۔ جن میں انہوں نے آنکھ کھولی۔ اُنہوں نے ان ہی تضادات کی چھاتیوں کا دودھ پیا اور تضادات کے یہ مرطوب جھونکے کسی شفیق اور مہربان ماں کی طرح اپنی ساری مامتا کے ساتھ ان کا پنگوڑا جھولتے جا رہے ہیں ___ وہ کشمیر کی اُلجھی ہوئی سیاست کی پیداوار ہی نہیں، بلکہ اس کے لاڈلے شہزادے اور آنکھوں کے تارے بھی ہیں۔

یہ دسمبر ۱۹۶۳ء کی بات ہے، شاید ان دنوں میر واعظ خاندان کا یہ کھلنڈرا لڑکا راجوری کدل کی کسی گلی میں مقامی ساخت کے بلّے سے کرکٹ کھیل رہا تھا۔ میر واعظ

منزل کے باوقار لیکن سنجیدہ اور خاموش مینار جھک جھک کر اس بچے کو آشیرواد دے رہے تھے، انہوں نے شاید بیت الحلم کے ہیرالڈ کی طرح کسی پُر اسرار ستارے کی پیشین گوئی سن لی تھی۔ برسوں کے عدم التفات کے بعد اب اُن کا نصیب اسی خوبصورت لڑکے کے ہاتھوں چمکنے والا تھا۔ تحریک شروع ہوتے ہی جب زمانے نے آنکھ جھپک کر دیکھا تو شرارتی نوجوان کو جس کی جان پہچان تہذیب (یعنی امیر اکدل) کے ساتھ فقط اتنی تھی کہ وہ عیدین کے دن وزیر اعظم بخشی کی خسروانہ عنایات کے لیے اس کے محل میں جاتا تھا اور پھر کسی تفریح گاہ کا رُخ اختیار کرتا تھا۔ لاکھوں کے مجمع کی مسندِ صدارت پر جلوہ نشین دیکھا۔ تاجپوشی کی یہ رسم مولانا مسعودی نے انجام دی۔ اس ارسطو صفت اتالیق کی عجیب خاصیت ہے کہ زمانے کے پیچ و خم کا راز داں اور اس کی شوخ وشیوں کا نباض ہونے کے باوجود یہ کسی سہارے، کسی سفارش کے بغیر زمانے سے مصافحہ نہیں کر سکتا۔ اس نے میر واعظ منزل کی چھائیوں میں اس اس غبار آلودہ قمقمے کو جھاڑا اور اسے اپنی سفارش بنایا اور اپنی چشمِ کرم کے گھنے گھنے سائے سے اس میں نور کی کرن پیدا کر لی۔ یہ نوجوان، جس کی مسیں بھی پوری طرح نہ بھیگی تھیں، ایجی ٹیشن کی مجلس عمل کا صدر بن گیا۔ تاریخ کے ساتھ اس کا یہ پہلا مصافحہ تھا۔ اور واقعات گواہ ہیں کہ اس نے بعد میں اس گرفت کو کبھی ڈھیلا نہیں چھوڑا۔ اس کی طفلانہ شوخیاں اور کم سنی کی جھجک چند ہی دنوں میں ہوا ہو گئیں۔ اور اس کی غیر تربیت یافتہ زبان پر جوش تقریروں کا گرجتا ہوا سر چشمہ بن گئی۔ بعد میں یاروں نے بڑا زور مارا کہ اس لڑکے سے قیادت کی زمام چھین لی جائے، لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ کام اس قدر آسان نہیں ہے۔ اور اس ترکِ غمزہ زن کی پُر اسرار طاقت شمعون (SAMSON) کی طرح حالات کے گیسوؤں میں پوشیدہ ہے۔ جو اُن کی رسائی سے باہر ہیں اور اس طور انہوں نے مفاہمت کی مجبوری کے آگے سر جھکا دیا۔

مولینا فاروق کی کم سنی کو ان کی سیاسی نو بلوغت کے مترادف نہیں لیا جانا چاہیئے۔ وہ ایک سلسلہ کی کڑی ہیں۔ اور اس طور اِس ننھے سے پودے کی جڑیں کشمیر کی عوامی زندگی میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان ہی جڑوں سے انہوں نے اس قدر رس حاصل کیا ہے، کہ وہ برسوں کا راستہ دنوں میں طے کر گئے۔ آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے کی بات ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں میں ایک ہی نام کا سکّہ چلتا تھا۔ میر واعظ کشمیر میر واعظ خاندان کے ہمایوں۔ میر واعظ یوسف شاہ تھے۔ روحانی اور مذہبی رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ مجلسی زندگی میں بھی اُن کا اِشارہ مسائل کا فیصلہ کرتا تھا۔ پھر ایک شیر شاہ سوری شیخ محمد عبداللہ کی شکل میں آیا۔ تصادم اور ٹکراؤ ہوئے اور ہمایوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ اُسی وقت میر واعظ خاندان کے معتقدین اور محبّ اپنے گریۂ سحری میں اگر انتقام کی نہیں تو انصاف کی دہائی ضرور دے رہے تھے۔ فاروق صاحب آگے آئے ہیں، تو ان بے نور آنکھوں میں دیدۂ یعقوبؑ کی طرح روشنی عود کر آئی ہے۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ فاروق صاحب میر واعظ خاندان کے جلال الدین اکبر ثابت ہوں گے یا نہیں۔ لیکن عقیدت مندوں کی محبت بھری آنکھیں اُنہیں ہزاروں لاکھوں دعائیں دے رہی ہیں۔ پُرانے زمانے میں کوئی راجپوت سورما اپنے دشمن کے ہاتھوں مارا جاتا تھا، تو اُس کی رانی ننھے بیٹے کو چاؤ اور شوق سے اپنے سورما باپ کا بدلہ چکانے کے لیے تیار کرتی۔ میر واعظ خاندان کے عقیدتمندوں کا بھی یہی گمان ہے کہ اس سلطنت کا کھویا ہوا وقار یہی لڑکا ڈھونڈ لائے گا۔ اور اسی لیے ان کی محبت کی لہروں نے فاروق صاحب کا سفینۂ قیادت اتنی کامیابی سے آگے بڑھایا ہے۔

یہ حقیقت اب کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کشمیر میں عوامی مقبولیت کا سہرا شیخ صاحب کے بعد صرف مولوی فاروق کے سر بندھا ہے۔ شیخ صاحب کا قد و قامت اس قدر

اونچا ہو چکا ہے اور انہوں نے تاریخ کے سرکش گھوڑے کی عنان اس اندازِ قاہری سے پکڑ لی ہے کہ اُن کے ساتھ تقابل ہر حال میں مبالغہ آمیز ہو گا، لیکن دونوں کی مقبولیت کے بنیادی محرکات میں چند مشترکہ خطوط صاف نظر آجاتے ہیں۔ دونوں کو ایک ہنگامۂ رستاخیز کی تند و تیز موج نے قیادت کے ساحل پر پھینک دیا — دونوں نے مذہبی عقیدت کے جذبات کی سیڑھی استعمال کر کے دلوں میں راہ بنالی شیخ صاحب کا جسمانی قد، اُن کی سیاسی قامت کی طرح بہت بلند ہے، لیکن فاروق صاحب بھی اوسط سے لمبے ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنے گلوئے جبرئیل آشوب کے زمزموں سے عوام کے مجمع لوٹ پوٹ کر رکھ دیئے اور خواتین کے ہیرو بن گئے۔ فاروق صاحب کی حسین اور رعنا شکل و صورت نے دلوں کی تسخیر کا یہی معرکہ انجام دیا۔

فاروق صاحب کے گلابی ہونٹ، سرخ سیب جیسے رُخسار، اور سنہری ریش اُنہیں کسی مولوی زادے سے زیادہ خلافت عباسیہ یا سلطنت مُغلیہ کا کوئی شہزادہ بنا دیتی ہے، لیکن ان کی اور شیخصاحب کی مقبولیت کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ شیخصاحب کی مقبولیت بے رحم زمانے کے ہیبت ناک پیچ و خم سے گذر کر صلابت اور استقلال کے آہنی قالب میں ڈھل چکی ہے۔ فاروق صاحب ابھی ایک مست شباب نوجوان کی طرح ان آزمائشوں سے نہیں نکلے۔ لیکن یہ بات بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ ان کا خاندانی پس منظر ان کی محدود مقبولیت کی انشورنس پالیسی بھی ہے۔ وہ ایک ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور اُن سے زیادہ اُن کے عقیدتمندوں کی عقیدت ان کی شخصیت کے ضمن میں نقش و نگار اُبھارتی ہے۔ شیخ صاحب اس کے برعکس اپنی پُر جلال شخصی تاریخ سے اپنے حلقہ بگوش کو بہت مبہوت اور مرعوب کرتے ہیں۔ دونوں کا اسلوب ظاہری مشابہت کے باوجود بنیادی طور جُدا گانہ ہے۔

مولانا فاروق کشمیر کی سیاسیات کی بھول بھلیوں میں نو آموز ہیں۔ نوآموزی کے ساتھ اُن کی مقبولیت نے اس میدان کے پرانے کھلاڑیوں کو اُن کا بیری بنا دیا

ہے۔ اوران کے رشک وحسد کا جواز بھی ہے ۔ عمر بھر کی قربانیوں، بہتر تعلیمی اکتسابات اور ذہنی صلاحیتوں کے باوجود اس خوب رو نوجوان نے اُنہیں پچھاڑ دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اُنہیں اس بڑی تلخ حقیقت پر ایمان لانا پڑ رہا ہے، لیکن اس میں فاروق صاحب کی خاندانی نجابت اور حسب ونسب کے ساتھ ان کی معاملہ فہمی اور سیاسی داؤ پیچ کے عرفان کا بھی دخل ہے۔ اُنہوں نے اپنے مختصر سے سیاسی کیریر میں کچھ اس غضب کے پینترے بدلے ہیں کہ اُن کی ذہانت کے بارے میں غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جب مجلس عمل کے صدر کی حیثیت سے ان کی پوزیشن مستحکم ہوگئی۔ تو یہ خیال تھا کہ مجلس عمل سے بے دخل کرنے کے بعد وہ گوشۂ گمنامی میں واپس چلے جائیں گے۔ لیکن انہوں نے جتنی بے جگری سے مزاحمت کی۔ وہ بے مثال ہے اور آخر مجلس عمل تو فنا ہوگئی، لیکن فاروق صاحب کی عوامی مجلسِ عمل پرچم لہراتی ہوئی زندہ رہی۔ پہلے خیال تھا کہ ان کی مقبولیت شہر کے چند محلّوں تک محدود ہے۔ لیکن اننت ناگ، بیجبہاڑہ اور دوسرے قصبوں میں اُن کا جو استقبال ہوا اُس نے اُن کے سیاسی مخالفوں کو بھی اپنے اندازوں پر نظرثانی کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔

میر واعظ یوسف شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند محمود احمد کی جگہ فاروق صاحب کا یہ منصب حاصل کرنا بھی کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ کشمیر کی سیاسیات کی پھسلتی ڈھلوان پر اُنہوں نے جس احتیاط سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا ہے۔ اس کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔

فاروق صاحب کی تقدیر دانستہ یا نادانستہ شیخ صاحب کے وجود سے کسی نہ کسی طرح میں وابستہ ہے۔ ان کے وجود کا قومی پیمانہ پر اعلان شیخ صاحب کے وجود کی حقیقت سے توجہ ہٹانے کے محرکات کا بھی مرہون منت ہے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ شیخ صاحب اپنے زیادہ پختہ کار سیاسی حریفوں، جن میں

بخشی غلام محمد اور میری دانست میں خود غلام محمد صادق بھی شامل ہیں سے اس طرح جھلا نہیں اُٹھے۔ جس قدر اپنی آنکھ کے اس چھوٹے سے تنکے سے۔ شاید وہی کیفیت ہے جس کا ذکر اقبال نے "میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح" والے مصرع میں کیا ہے۔ فاروق صاحب اس عظیم چنار کے درخت کی چھاؤں میں ہونے کے ساتھ ہی اپنی منفی صلاحیت کے زور سے آگاہ ہیں، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس کا استعمال ہمیشہ مثالی طریقے پر کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات کے لیے ان کی بے قراری کی تہ میں اس خواہش کا سراغ لگانا ممکن نہیں کہ وہ شیخ صاحب کی ہمسری کے لیے کبھی کبھی چبوترے پر چڑھ کر اپنے قد کے اونچے ہونے کا باور دلاتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تاریخ کی سطح سے ہی نباہ کرنا سیکھا ہے۔ اس کے باطن میں پلنے والے طوفانوں سے آگہی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے شیخ صاحب جیسی ہی بے نیازی دکھائی ہے۔ یہ اُن کی کوتاہی کے ساتھ ساتھ اُن کی قوم کی بدنصیبی بھی ہوگی۔ مگر ایک بات میں وہ شیخ صاحب تک سے بازی لے جاتے ہیں۔ وہ کشمیر کے رہنماؤں میں سب سے زیادہ کم عمر ہیں اور اس عمر میں اُنہیں مقبولیت کی متاع حاصل ہوگئی ہے۔ اگر انہوں نے تاریخ کے دھاروں کا راز سمجھنے کا ملکہ پیدا کرلیا، تو کشمیر کے اُفق مستقبل پر ان کی درخشانی کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

قاسم صاحب

بعض شخصیتیں اپنی ظاہری آب و تاب اور چمک دمک سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ ان کی چھاؤں میں بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے تھکن کا احساس تو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ اس کے برعکس کچھ شخصیتوں کی لو بہت دھیمی اور ہلکی ہوتی ہے۔ یہ چکا چوند پیدا نہیں کرتیں، بلکہ ایک سکون آمیز روشنی کا اہتمام کرتی ہیں۔ سید میر قاسم کی شخصیت اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی ذہانت خیرہ کن نہیں اور ان کی شخصیت میں بھی کوئی چندھیا دینے والی بات نہیں۔ ان کی لو بہت مدھم اور آنچ بہت دھیمی ہے۔ بہت دیر تک روشنی اور حرارت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ بعض مرتبہ اس چراغ کی لو بھڑک اٹھتی ہے اور اس کے بطن سے کوئی چنگاری بھی جنم لیتی ہے لیکن ایسا بہت کم ہے۔

قاسم صاحب ڈورو شاہ باد کے ایک پیر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ واعظ خوانی اور پیری مریدی انہیں ورثے میں ملی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ قاسم صاحب کسی مکتب میں پڑھ لکھ کر عالم فاضل بن جاتے لیکن ہوا یہ کہ وہ علی گڑھ میں آکر ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی ہوگئے۔ اپنے خاندانی اثرات اور اپنے ماحول سے بغاوت کرنے کے باوجود قاسم صاحب کا ذہن اپنی روایات سے آزاد نہ ہو سکا انہوں نے ایم۔ اے فارسی میں کیا اور علی گڑھ میں اپنے آپ کو مسلم لیگ کی سیاسیات سے وابستہ کر لیا۔ اپنی طالب علمی کے دوران

انہوں نے مرحوم لیاقت علی خاں کے انتخاب میں زوروں سے حصّہ لیا۔ اس سلسلے میں کچھ دیر تک قاسم صاحب قائداعظم مسٹر جناح کے عطا کردہ سرٹیفکیٹ کی نمائش بھی کرتے رہے، لیکن علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کی سیاسی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوگیا۔ نظریاتی طور پر نہیں بلکہ کشمیر کے اس وقت کے سیاسی تقاضوں کی وجہ سے نیشنل کانفرنس سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں انہیں خواجہ غلام محی الدین قرہ کی قربت حاصل ہوئی۔
اور رفتہ رفتہ مارکسزم اور اشتراکیت سے دل چسپی پیدا ہوگئی، لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ قاسم صاحب کی دل چسپی کسی اندرونی تحریک یا تلاش کا نتیجہ نہ تھی۔ ان کے ماحول کی پیداوار تھی۔ اسی لیے اشتراکی فلسفے نے قاسم صاحب کو متاثر ضرور کیا ہے۔ لیکن مغلوب نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انہوں نے کبھی مارکسزم یا اشتراکیت کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ "تحریک کشمیر چھوڑ دو" میں جیل جانے کے بعد میر قاسم صاحب نیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن بن گئے۔ اور بعد میں وہ بیگ صاحب کے پی اے مقرر ہوئے، لیکن کچھ دیر بعد مستعفی ہوگئے۔ شیخ صاحب (کچھ لوگوں کا کہنا ہے، کہ شیخ عبدالرشید) کی وساطت سے وہ کانسٹی چیونٹ اسمبلی میں لیے گئے اور چیف پارلیمنٹری سیکریٹری مقرر کیے گئے۔ معاہدہ دہلی کی بات چیت میں شیخ صاحب انہیں بھی ساتھ لے گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ قاسم صاحب ان دنوں آزاد اور خود مختار کشمیر کے تصوّر کو خوش آمدید اور خوش گوار سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے وہ بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق سے زیادہ شیخ صاحب کے قریب تھے۔ ۱۹۵۳ء کے اوائل میں انہیں آنے والے خطرات کا احساس ہوگیا اور وہ رفتہ رفتہ بخشی غلام محمد کے ہمنوا بنتے گئے۔ ۱۹۵۳ء کے بعد کشمیر کی سیاسیات میں ان کا رول نمایاں ہوتا گیا۔ اور کچھ وقت کے لیے بخشی غلام محمد کے منظور نظر بھی رہے لیکن بخشی غلام محمد کا منظور نظر ہونے کے لیے اپنے آپ کو احمق اور بیوقوف ثابت کرنا ضروری تھا۔ ان کے دربار میں

ذہانت اور ذکاوت کے لیے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ جب قاسم صاحب کی ذہانت اور ان کے سوچنے سمجھنے کا شہرہ بخشی صاحب کے کانوں تک پہنچا تو انہیں بیک وقت کمیونسٹ اور مُلا کہہ کر دربار بدر کر دیا گیا۔ اس دوران قاسم صاحب کو صادق صاحب اور شری ڈی۔ پی۔ در کی رفاقت حاصل ہوگئی۔ نیشنل کانفرنس سے الگ ہو کر جب صادق صاحب نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس قائم کی، تو میر قاسم نے بڑی استقامت اور تن دہی سے اس جماعت کو ایک مضبوط عوامی اساس دینے کا بیڑا اُٹھایا۔ بخشی صاحب کے دور میں اپوزیشن کا کام اتنا آسان اور دلکش نہ تھا۔ جتنا آج ہے۔ قاسم صاحب نے بڑے حوصلے اور بے جگری سے ان تمام مصیبتوں کا مقابلہ کیا جو بخشی صاحب ان پر نازل کرتے رہے۔ بعد میں مرکزی رہنماؤں کی مدافعت اور مشورے سے جب ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے رہنما واپس نیشنل کانفرنس میں شامل ہوگئے۔ تو قاسم صاحب ایک بار پھر وزیر ہوگئے۔ لیکن بخشی غلام محمد سے کشمکش ختم ہونے کے بجائے بڑھتی گئی۔

اگست ۱۹۶۳ء میں بخشی صاحب کے مستعفی "کیے" جانے کے بعد جنگِ جانشینی کا پہلا دور شروع ہوا۔ تو بعض صادق صاحب میں کچھ "وفادارانِ ازلی" نے سید میر قاسم کو وزیر اعظم منتخب کرنا مان لیا تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق بخشی غلام محمد انہیں LESSER EVIL مان کر اپنا جانشین نامزد کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن واقف کار حلقوں کا کہنا ہے کہ مشہور راشتراکی رہنما میر راجپوری اس پر رضامند نہ تھے۔ بہر کیف ریاست کے اندر اور باہر کئی مرتبہ سنجیدگی سے سید میر قاسم کا نام وزارت عظمیٰ کے لیے لیا گیا۔

قاسم صاحب وزارت چھوڑ کر نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری ہو گئے ہیں۔ پورے گیارہ سال پہلے ۱۹۵۳ء کے ہنگامے کے بعد بھی ان کا نام نیشنل کانفرنس کی جنرل سیکریٹری شپ کے لیے تجویز ہوا تھا۔ اس وقت بخشی صاحب کے ذہن میں آنے والے دور کے تانے بانے بنے جا رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے بخشی عبدالرشید

کو ہی جنرل سیکریٹری منتخب کیے جانے کا انتظام کر لیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ صادق بخشی اختلاف کی بنیاد دراصل یہیں سے پڑتی ہے۔

میر قاسم شریف الطبع اور نرم رو ہیں۔ ان کے بارے میں صرف ایک بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے اور وہ یہ ان کی زندگی بے داغ اور نہایت ستھری ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ان کے سیاسی عقائد سے زیادہ ان کی مذہبی تربیت کا حصّہ ہے۔ وہ کسی کا سہارا لے کر سیاست کے میدان میں نہیں آئے محنت اور ذہانت اور ریاضت سے آگے بڑھے ہیں۔ وہ اچھے مقرر ہیں لیکن ان کی تقریروں میں دانشورانہ ذہانت کے شعلوں سے زیادہ دہقانی تجربے کی آنچ آتی ہے۔ ان کے لب ولہجہ، طرز فکر اور طرز زندگی میں دیہات کا اثر نمایاں ہے۔

میر قاسم نظریاتی طور پر کسی مخصوص ازم سے تعلق نہیں رکھتے اور اُن کو آپ کسی بھی ازم یا موقف سے وابستہ کر دیجئے، وہ دلائل و براہین سے اس کی مقبولیت اور عظمت ثابت کر سکیں گے۔ یہ اُن کی ابتدائی تربیت کا کرشمہ ہے۔ ملائیت اور وکالت کے امتزاج نے قاسم صاحب کی شخصیت میں ایک خوشگوار توازن پیدا کر دیا ہے وہ انتہا پسند تو نہیں لیکن اپنے بعض معتقدات کے سختی سے پابند ہیں۔ کچھ عرصہ سے انہیں اپنی شرافت سے زیادہ اپنی ذہانت پر اعتماد بڑھتا جا رہا ہے۔ قاسم صاحب کی مقبولیت کا راز ان کی ذہانت نہیں، ان کا حلم اور ان کی شرافت تھا۔ لیکن سیاسی میدان میں پے در پے کامیابیوں نے اُن کی حصول اقتدار کی بھوک بڑھا دی اور یہ توازن درہم برہم ہو گیا۔ اب قاسم صاحب اپنے آپ کو مرکزِ کائنات سمجھنے لگے۔ اور انہیں یہ زعم ہو گیا کہ کشمیر اور ہندوستان کا الحاق ان کے دم قدم سے قائم ہے ہندوستانی لیڈروں نے بھی قاسم صاحب کی انا کو تقویت پہنچائی۔ انہیں اقوام متحدہ میں ہندوستانی ڈیلی گیشن کا ممبر بنا کر بھیجا گیا۔ ان سے وہاں

ایک عدد تقریر بھی کروائی گئی اور قاسم صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اب وہ بین الاقوامی سطح کے لیڈر ہو گئے ہیں۔

نیشنل کانفرنس کو نیشنل کانگریس میں مدغم کرانے کا فیصلہ بھی بہت حد تک اسی خواہش کا اظہار تھا۔ جوں جوں قاسم صاحب کا دائرہ کار اور حد اختیار بڑھتا گیا۔ ان کے مزاج میں رعونت اور کردار میں فرعونیت نمایاں ہونے لگ گئی اور ایک ایسا بھی وقت آ گیا، کہ نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری بخشی عبدالرشید اور سید میر قاسم میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ قاسم صاحب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ کانگریس حکومت اور الحاق کے تینوں ستون ان کے کندھوں پر قائم ہیں۔ اور ان کی ذراسی جنبش سے یہ سارا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔ ان کو یہ وہم ہو گیا کہ خود صادق صاحب کا وجود بھی انہی کی حکمت عملی کا مرہون منت ہے۔ اب وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اصلی وزیراعظم سمجھنے لگے اور صادق صاحب کو اپنے وجود کا سایہ!

شاطر اعظم ڈی۔ پی۔ درنے سید میر قاسم کے خوفناک عزائم کو شہ دینا شروع کر دی اور انہیں اس بات کا یقین دلایا کہ وہ صادق صاحب کے مقابلے میں ہر لحاظ سے زیادہ موثر اور بہتر وزیراعلی ہو سکتے ہیں۔ زمین پہلے سے ہموار تھی۔ ڈی۔ پی۔ صاحب کی "کاشتکاری" نے اس میں نئے ارادوں اور نئے عزائم کی فصل اُگا دی۔ قاسم صاحب اور صادق صاحب کے درمیان اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی۔ قاسم صاحب بنیادی طور پر جذباتی آدمی ہیں۔ جب صادق صاحب نے ان اختلافات کو نظر انداز کر کے خود قاسم صاحب کو بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا، تو انہوں نے ایک دن کانگریس کی صدارت اور اسمبلی کی ممبری دونوں سے استعفیٰ دے کر اپنے دشمنوں کو حیران اور اپنے دوستوں کو پریشان کر دیا۔ اس استعفیٰ کا مقصد کیا تھا ابھی تک اس کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکی ہے۔ قاسم صاحب

کا کہنا ہے کہ اس استعفیٰ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ صادق صاحب کی جگہ وزیراعلیٰ نہیں بننا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کے واقعات نے ان دعوؤں کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

درگا پرشاد در صاحب

درگا پرشاد در ماسکو میں ہندوستان کے سفیر بن کر جا رہے ہیں۔ یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے، ریڈیو سے نشر ہوئی۔ اور خود در صاحب نے چراغ بیگ کو سنائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگ یہ پوچھتے رہتے ہیں، کہ کیا وہ واقعی جا رہے ہیں؟ حق بات یہ ہے کہ کسی کو یقین نہیں آرہا ہے، کہ وہ کشمیر چھوڑ کر کہیں جا سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں ماسکو میں سفیر مقرر کیے جانے کی گپ خود در صاحب نے ہی اڑائی ہے، مگر چراغ بیگ جانتا ہے کہ در صاحب بالآخر کشمیر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اپنی مرضی سے جا رہے ہیں اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ جا رہے ہیں۔ روس میں ہندوستانی سفیر کا عہدہ کسی بھی ڈپلومیٹ کے لیے باعثِ افتخار ہو سکتا ہے۔ لیکن درگا پرشاد در کے لیے یہ اعزاز قید بامشقت سے کم نہیں۔ ریاستی سیاست کے جنگل میں چوکڑیاں بھرنے والا ہرن اب ماسکو کے چڑیا گھر میں نمائش کے لیے رکھا جا رہا ہے۔ اس پنجرے میں دنیا بھر کی آسائشیں اور لذتیں مہیا ہوں گی۔ لیکن وہ وسعتیں کہاں سے آئیں گی۔ جنھوں نے درگا پرشاد در کو ڈی، پی بنا دیا تھا!

پورے بتیس۳۲ برس تک کشمیر کی سیاسی زندگی پر چھائے رہنے کے بعد ڈی، پی نے بادل ناخواستہ کشمیر کی سیاسی رزم گاہ سے فرار ہو جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہیں گے یا نہیں؟ اس کے متعلق بھی حتمی طور پر کچھ نہیں

کہا جاسکتا، کیونکہ ان کی کسی بات پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ ریاستی سیاست سے دل برداشتہ ہوگئے ہیں اور اپنی زندگی میں پہلی بار شاید انہیں احساس ہوگیا ہے کہ نامساعد حالات کو اپنے موافق بنانے کی ان کی صلاحیتیں محدود ہوگئی ہیں یا دوسرے الفاظ میں ان کی شخصیت کا جادو بے اثر ہوگیا ہے۔ سرینگر سے ماسکو کا سفر اسی تکلیف دہ حقیقت کا اعتراف ہے!۔

اس بات کا شاید ڈی۔ پی کے بدترین دشمنوں کو بھی اعتراف ہوگا کہ ان کے چلے جانے سے کشمیر کی سیاسی زندگی میں ایک بہت ہی رنگین، دل آویز اور دلچسپ شخصیت کی کمی بُری طرح محسوس کی جائے گی۔ وہ بیس برس تک کشمیر کے سیاسی نگارخانے کی زینت بنے رہے اور اُن کے دم قدم سے بہت سی رنگینیاں اور رعنائیاں وابستہ تھیں۔ وہ چلے جائیں گے تو کچھ دیر کے لیے محفل پر سکوت طاری ہوجائے گا۔ اس کے بعد ان کی خوبیاں اور خامیاں گنائی جائیں گی اور مجھے یقین ہے کہ برائیاں کرنے والے بھی ان کی خوبیوں کا تذکرہ کریں گے۔

کشمیر کے ایک جاگیردار گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود ڈی۔ پی کا شمار کشمیر کے ان ”ترقی پسند“ نوجوانوں میں ہوتا ہے جو ۱۹۴۵ء میں انقلاب کی تلاش میں تحریک آزادی سے وابستہ ہوگئے اور صرف دو برس کی ”جدوجہد“ کے بعد انقلاب کی برکتوں سے کچھ اس طرح فیضیاب ہونے لگے، کہ جوں جوں انقلاب کا دم گھٹنے لگا یہ لوگ بلندیوں کی طرف پرواز کرنے لگے۔ آج اکیس برس کے بعد جب ڈی۔ پی پیچھے کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ وہ انقلاب کو بہت پیچھے چھوڑ کر خود بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہ درگا پرشاد در کی قسمت اور ڈی۔ پی کی بے پناہ ذہانت کا کرشمہ ہے!

۱۹۴۷ء میں جب حالات کی سازش نے نیشنل کانفرنسی لیڈروں کو اقتدار کی

پوٹلی سونپ دی، تو ڈی، پی ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان تھے، جن کی تقریر، تحریر اور اُٹھان نے شیخ صاحب اور اُن کے دوسرے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ صرف دو سال کے مختصر سے وقفے میں درگا پرشاد در نے اقتدار کے ایوانوں میں اپنی جگہ بنا لی اور وہ بڑی مستعدی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ہوم سیکریٹری سے آئین ساز اسمبلی کے ممبر اور ممبری سے ڈپٹی ہوم منسٹر بن گئے، اس کے بعد ڈی۔پی نے پیچھے کی طرف نہیں دیکھا، اپنی بے پناہ ذہانت اور فطانت کے سہارے وہ شیخ صاحب کے معتمدِ خصوصی بن گئے اور شیخ صاحب جب کسی پر بھروسہ کرتے ہیں تو اس کے خلاف کوئی بات سُننا گوارا نہیں کرتے۔ ڈی۔پی نے ان کا اعتماد ہی حاصل نہیں کیا، وہ اُن کے اقتدار میں بھی شریک ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی ۱۹۵۳ء کے شب خوں کی تاریخ بھی شروع ہوتی ہے!

ڈی۔پی در کا شمار ۱۹۵۳ء کے افسوسناک ڈرامے کے ان مرکزی کرداروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے ڈرامے کا مسودہ بھی لکھا، اس کی ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیئے اور پھر اہم کردار بھی ادا کیے۔ اس غارت گری کو نظریاتی تصادم کا لبادہ اوڑھانے کا سہرا خاص طور ڈی، پی در صاحب ہی کے سر رہے گا۔ اس کے بعد وہ بخشی غلام محمد کے دستِ راست بن کر عملاً ریاست کے سیاہ سفید کے مالک بن بیٹھے۔ بخشی صاحب کو اپنی بے لگام سیاست کی سائنسی اور فلسفیانہ تاویلیں کرنے کے لیے ایک پڑھے لکھے نائب کی ضرورت تھی اور ڈی۔پی صاحب میں میکاولی کی وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو بخشی صاحب کو بے حد مرغوب تھیں۔ اقتدار کے جاہ و جلال سے ڈی۔پی کی شخصیت اور زیادہ نکھر گئی۔ اپنی متواتر کامیابیوں پر مغرور ہو کر وہ کبھی کبھی بخشی صاحب کی طرف دیکھ کر بھی غرّانے لگے۔ بخشی صاحب سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ اقتدارِ مطلق میں کسی کی شرکت برداشت نہیں کر سکتے تھے اور

ڈی، پی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس صورتِ حال سے مطمئن نہیں، لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بخشی غلام محمد سے لڑنا آسان نہ ہوگا۔ اس لیے انھوں نے نیشنل کانفرنس میں "نظریاتی تصادم" کے لیے فضا ہموار کرنا شروع کر دی۔

۱۹۵۷ء میں ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے نام سے کانفرنس کے کچھ اہم اور بااثر لیڈروں نے بخشی صاحب کے خلاف بغاوت کر دی اور ڈی، پی باغیوں کی رہنمائی کرنے لگے، لیکن اقتدار کے نرم و نازک مسندوں پر چلنے والے پاؤں جدوجہد کی پُر خار وادیوں میں قدم رکھتے ہی لہولہان ہوگئے۔ اور صرف تین سال کے وقفے کے بعد ڈی۔ پی صاحب قاسم صاحب کو لے کر بخشی کے دربار میں پہنچ کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگنے لگے اور ڈی، پی صاحب پھر صاحب اقتدار ہو گئے۔

اس کے بعد ۱۹۶۳ء کا سانحہ در پیش آیا اور ڈی۔ پی صاحب کچھ دیر کے لیے پھر اقتدار سے محروم ہو گئے۔ اس وقت اُن کی حالت دیکھنے والی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی ظالم نے شیر خوار بچّے سے دودھ کی بوتل چھین کر اُسے بھوکوں مارنے کا فیصلہ کر دیا ہو۔ چراغ بیگ نے ان دنوں ڈی۔ پی صاحب کو ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے دیکھا ہے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آدمی اقتدار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ موئے مقدس کی گمشدگی نے ڈی۔ پی کو ایک بار پھر اقتدار سے وابستہ کر دیا۔ اور ۱۹۶۴ء میں صادق صاحب کے وزیر اعظم بننے پر پھر انھیں اپنی کھوئی ہوئی منزل مل گئی، جب سے اب تک وہ بدستور کشمیر کے سیاسی آسمان پر چمک رہے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اُن کے عروج کا سورج غروب ہو رہا ہے اور حالات کی سازش نے انہیں اس درجہ مجبور اور بے بس بنا دیا ہے کہ وہ یہاں سے بھاگنے میں ہی اپنی خیریت سمجھتے ہیں۔

ڈی۔ پی صاحب کی زندگی ایک دلچسپ داستان بھی ہے اور ایک عبرتناک

افسانہ بھی! ان کی شخصیت کی رعنائی اور ان کے کردار کی رنگینی نے انھیں کشمیر کا سب سے بااثر اور بارسوخ سیاسی ادارہ بنا دیا تھا، حالانکہ زندگی بھر انہیں کسی سیاسی نظریئے، اعتقاد یا فلسفے پر اعتماد نہیں رہا۔ وہ سیاسی میدان میں تنہا آئے اور آج بیس برس بعد تنہا جا رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی عوامی مقبولیت یا عوامی اساس کی پروا نہیں کی اور کشمیر کے مخصوص سیاسی حالات میں ان کا یہ رویہ کچھ غلط بھی نہیں تھا ڈی۔ پی صاحب اچھے دوست ہیں یا نہیں، یہ وہی کہیں کہہ سکتے ہیں کہ جن کو اُن سے دوستی کرنے کی سعادت حاصل رہی ہو لیکن چراغ بیگ کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ ایک اچھے دشمن تھے۔ ان سے لڑنے میں لطف آتا تھا۔ وہ وار کرنا جانتے تھے اور وار سہنا بھی۔ ان سے لڑتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے "محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے،" کے اصول پر بڑی سختی سے کاربند ہیں۔ اس لیے ضرورت پڑنے پر اپنے بدترین دشمن کو بھی سینے سے لگاتے ہیں اور اپنے بہترین دوستوں کو تختۂ دار پر لٹکانے سے نہیں ہچکچاتے۔ جہاں اُن کی گرم گفتاری کام نہیں آتی، وہاں اُن کی شیریں بیانی اپنا جادو دکھاتی ہے۔ وہ جنگ جیتنے کے لیے جان بوجھ کر لڑائیاں ہارتے ہیں۔ دشمن کو غافل پا کر پھر ایسا بھرپور وار کرتے ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتا کہ حملہ کہاں سے ہوا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۵ء تک وہ بڑی بے جگری کے ساتھ بخشی غلام محمد کے خلاف لڑتے رہے لیکن جب ۱۹۶۰ء میں ڈی، پی نے اپنے مخلص ترین ساتھیوں کو دغا دے کر بخشی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تو وہ ایک بار پھر بخشی عبدالرشید کے لنگوٹیے یار بن گئے۔ یہ دوستی اُس وقت تک قائم رہی جب تک بخشی عبدالرشید کی مدد سے وہ ایک بار پھر ممبر اسمبلی ہو گئے۔

ڈی، پی جادوگر ہے وہ جس سے دوستی کا دم بھرتا ہے اُسے کچھ اس طرح اپنے

شیشے میں اتارتا ہے، کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے لیکن اس کی اکثر دوستیاں مصلحتوں اور ضرورتوں کے تابع ہی ہوا کرتی ہیں۔ وہ بے حد ذہین اور بے پناہ چالاک اور بے مثال CONVERSATIONALIST ہے اور اس لحاظ سے اس میں ایک سفیر کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اُسے انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے اور اس نے اپنی خوش کلامی سے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ ڈی، پی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ایک مخصوص معاشرے میں ایک انسان کس طرح اپنی غیر معمولی ذہانت اور فطانت کے سہارے اقتدار اعلیٰ کے ایوانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتا بلکہ اپنے سے طاقت ور حریفوں کو نیچا بھی دکھا سکتا ہے۔ وہ پورے بیس برس تک بڑے بڑے مقبول عام لیڈروں کے مقدر کا فیصلہ کرتا رہا۔ حالانکہ بقول شمیم احمد شمیم خود اسے اپنی گاڑی کے ڈرائیور کا اعتماد بھی حاصل نہیں تھا۔ اس نے زندگی بھر کبھی کسی اصول، ضابطے یا قاعدے کی پروا نہیں کی۔ وہ صرف آگے بڑھنا جانتا ہے چاہے ایک قدم آگے بڑھنے میں سینکڑوں اصولوں اور آدرشوں کا خون ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے متعلق یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ کمیونسٹ ہے یا سوشلسٹ، سوتنتر ہے یا گن تنتر اور میرا اپنا خیال ہے کہ وہ کمیونسٹ ہے نہ سوتنتر، وہ صرف ڈی۔ پی۔ دَر ہے۔ میدان سیاست کا ایک کامیاب کھلاڑی ہے جو پچھلے بیس سال کے دوران اپنے سے بہتر کھلاڑیوں کو مات دے چکا ہے، جو بہت سے لوگوں کو مار کر خود زندہ ہے۔ اس لیے کہ اُسے زندہ رہنے کا گر آتا ہے۔ ڈی، پی خوش طبع ہے، خوش گفتار بھی اور خوش پوش بھی۔ اس کے چلے جانے سے ریاستی حکومت اور ریاستی اسمبلی بے رنگ ہو جائے گی۔ بہت سے لوگ حکومت اور ڈی۔ پی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں اور حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والے اکثر محرمانِ راز کا خیال ہے کہ ڈی، پی کے بغیر صادق صاحب کا حکومت چلانا ممکن نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ اندیشہ ہائے دور دراز کہاں

تک صحیح ہیں، لیکن ایک بات کا مجھے بھی احساس ہے اور وہ یہ کہ اُن کے چلے جانے سے ریاستی اسمبلی کی آدھی رونق چلی جائے گی، بقول شمیم احمد شمیم "ڈی، پی کے بعد سرکاری بنچوں پر کوئی ایسا حریف ہی نظر نہیں آتا جس سے دو دو ہاتھ کرنے میں اپنی تحقیر کا اندیشہ نہ ہو،" ڈی، پی بے حد حاضر جواب، بہت اچھے پارلیمنٹرین اور بڑے قابل آدمی ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ ان کی ساری قابلیت اور صلاحیتیں حقیر مقاصد اور ذاتی مفادات کیلئے ہی وقف رہیں۔ اگر بے پناہ ذہانت اور غیر معمولی فطانت کے ساتھ انہیں دیانت اور خلوص کی دولت بھی نصیب ہوتی تو وہ کامیاب سیاستداں ہی نہیں۔ ایک عظیم انسان بن سکتے تھے۔ "آئینہ" کو جہاں اس بات کی خوشی ہے کہ ڈی، پی کے خلاف اس کی مسلسل اور موثر جنگ کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا ہے وہاں اس بات کا بھی افسوس ہے کہ اب ریاستی سیاست میں کوئی ایسا حریف نظر نہیں آتا کہ جس پر وار کرنے میں اپنی سُبکی محسوس نہ ہو۔

سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء

قرہ صاحب

کشمیر کی سیاسیات کے کسی کردار کا گراف اس قدر پیچ وخم کا حامل نظر نہیں آئے گا، جس قدر اس بجھے ہوئے انگارے کا، جس کی خیرہ کرنے والی روشنی نے ایک وقت صفِ اوّل کے سبھی رہنماؤں کو سہما اور گھبرا دیا تھا۔ شیخ صاحب اقتدار کھو بیٹھے لیکن وہ دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ بخشی غلام محمد اپنی چالاکیوں کے جال میں پھڑپھڑا رہے ہیں، لیکن کشمیر کی تاریخ کی ایک دہائی پر ان کے نام کا قشقہ کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی۔ بیگ صاحب شیخ صاحب کی نظرِ عنایت کی دھوپ میں نہا رہے ہیں اور محاذ کے مجاز ہیں۔ مولینا مسعودی کی قلندرانہ وضع پر ان کی موجودہ بے سرو سامانی کی قبا کچھ زیادہ ناموزوں معلوم نہیں ہوتی۔ صادق صاحب کا تو خیر اس ضمن میں ذکر ہی بے جا ہے۔ ایک قرہ صاحب ہیں جو اقتدار کے لیے بنے معلوم ہوتے ہیں، لیکن جنہیں اس شجرِ ممنوعہ کو کبھی ہاتھ لگانے کا موقع نہیں ملا جنہیں کبھی شیخ صاحب کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی لیکن جنہیں اب عوام بھی فراموش کر چکے ہیں۔ قرہ صاحب جو ایک وقت روشن خیالی کی تیز رفتاری میں "الحاد" کی خندق تک جا پہنچے تھے لیکن اب تھک کر اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ انہوں نے ناچار "ایمان" کی چھاؤں میں اپنا مصلےٰ کھول دیا ہے۔ جن کا وجود اب اپنی شکست کی آواز ہے اور بس۔

شیکسپیئر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہی آدمی کامیابی کی چوٹی پر پہنچ سکتا ہے جو

پہلے قدم آہستہ اُٹھائیے قرہ صاحب کی شانِ نزول اس کے بالکل متضاد رہی ریٹہ مالو کے رئیس گھرانے کا یہ لاڈلا لیکن کسی قدر بریہم مزاج فرزند جب اس صدی کی تیسری دہائی میں علی گڑھ سے واپس آیا تو وہ ایک دہکتا ہوا انگارہ تھا۔ ایسا انگارہ جس کو ہاتھ لگانا تو درکنار جس کی جانب نظر بھر دیکھنے سے اس کے رفیقوں کو ہول آتا تھا۔ اُن سے پہلے ایک اور صاحب بھی آئے تھے، ان کے چچیرے بھائی غلام محمد صادق لیکن نوجوان غلام محی الدین کی چکا چوند کے آگے ان کی دھیمی دھیمی آنچ کچھ ماند سی پڑ گئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ کامیابی کا عشوہ فروش نازنین تاج اسی کے سر پر رکھے گی۔ اس کی تقریر میں انقلاب گرجتا تھا، اس کی سرگرمیوں میں بجلیاں حکمتی تھیں اور اس کے تیور بڑے ہونہار بڑے سازگار ثابت ہو رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء کی تاریخی ساعت آگئی۔ ڈوگرہ مہاراج کے خلاف آخری معرکہ آرائی کا وقت۔ شیخ محمد عبداللہ جو ان دنوں اپنی ذات میں تحریک اور اپنی شخصیت میں قوم تھے، نے تلوار بازی کا ایک اور پینترا بدلا۔ کشمیر چھوڑ دو کی تحریک شروع ہو گئی۔ بخشی صاحب اور صادق صاحب اس غیر متوقع افتاد سے بچنے کے لیے لاہور کے عافیت کدے میں پہنچ گئے۔ بیگ صاحب اننت ناگ کے بارے میں لطیفے اڑاتے رہے اور شیخ صاحب کے قد آدم سائے میں انقلابی قرہ صاحب کی جذبات آمیز خطابت ہنگامہ بپا کرتی رہی۔ اُن دنوں لاکھ لاکھ کے پرجوش جلسوں میں اقبال کا یہ شعر دُہراتے تھے ؏

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

تحریک کامیاب رہی لیکن خود محی الدین صاحب کا سراغ نہ مل سکا۔ کشمیر چھوڑ دو کے درمیان وہ روپوش رہ کر تحریک چلاتے رہے اور یہ اُن کی زندگی کا

سب سے رنگین اور شاداب نخلستان ہے۔ وہ ایک لیجنڈ ایک افسوں بن گئے۔ "بلبلِ کشمیر" کا نام کشمیر کے لوک ادب کا حصّہ بن گیا اور شوخ کنواریوں نے رُوف کی تانوں پر اس کے گیت گائے۔ اقتدار حاصل ہو گیا اور قرہ صاحب کے الفاظ میں "ہم نے اس تاج کو لال چوک میں زمین سے اُٹھا لیا" قرہ صاحب ایک دُم دار اور چمکتے ستارے کی حیثیت سے سیاسی اُفق پر چھا گئے۔ لیکن اُن کے زیادہ شاطر حریف اس ستارے کو توڑنے کے لیے کمین گاہوں سے تاک لگائے بیٹھے تھے۔ بہت جلد قرہ صاحب نے ایک بگڑے ہوئے بچے کی طرح اپنی جوشیلی طبیعت سے اُن کے لیے موقع فراہم کر لیے۔ خود شیخ صاحب اس وہم کے شکار ہو گئے کہ یہ ستارہ اُن کی اپنی آب و تاب کا حریف ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کسی شہابِ ثاقب کی طرح یہ ستارہ روشنی کی ایک تیز لیکن مٹتی ہوئی لکیر پیچھے چھوڑ کر آسمانِ اقتدار سے ٹوٹ کر گر پڑا۔

قرہ صاحب خیال اور جذبے کا ایک ایسا پیکر ہیں جو "چشمۂ حیوان" پر پہنچ کر اپنا جام توڑ دیتے ہیں۔ اس میں ان کی قلندری کا نہیں، ان کی ناصبوری اور تڑپتے ہوئے جنون کا دخل ہے۔ انہوں نے اقتدار سے نکلنے کے بعد یہاں پہلی بار تعمیری بنیادوں پر شیخ صاحب کی سیاست کی مخالفت کی داغ بیل ڈال دی۔ اور اگر وہ چند ہی مہینوں کے لیے اسی لائن پر چلتے، تو کشمیر کا مستقبل اُن کی چوکھٹ پر سر بسجود ہو گیا ہوتا۔ لیکن قرہ صاحب آنچ سے نکلے ہوئے انقلابی نہیں بلکہ ایک جذباتی رومان پرست ہیں۔ ۱۹۵۳ء کے پہلے وسط میں شیخ صاحب نے روٹھے ہوئے کشمیریوں کو منانے کی کوشش شروع کی۔ تو قرہ صاحب انہیں یہ رعایت دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کی نظروں میں شاید "بلبلِ کشمیر" کی رنگین تصویر گھوم رہی تھی۔ پاکستان کا سب سے بڑا مخالف ہوتے ہوئے۔ بھی

بھی پاکستان زندہ باد کا نعرہ اُن کے ہونٹوں پہ آگیا اور اس طرح وہ اُس سیاسی دلدل میں پھنس گئے، جس سے نکلنے کے لیے وہ آج تک ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ لیکن ہر قدم آگے بڑھانے کے ساتھ وہ اور زیادہ گہرائیوں میں دھنس جاتے ہیں اور اب تھک ہار کر اپنی قسمت سے سمجھوتہ کر کے تقریباً خلوت گزیں ہوگئے ہیں۔

قرہ صاحب کا المیہ چھوٹے پیمانے پر وہی ہے جو روس کے ٹراٹسکی اور ہندوستان کے سبھاش چندر بوس کا تھا۔ ان کی چمک دمک فرحت سے زیادہ اذیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ روشنی کچھ ایسے انداز رکھتی ہے، کہ اسے جلتے رکھنے کے بجائے کچھ لوگ اسے بجھانے پر مائل ہوتے ہیں۔ وہ اعتماد نہیں بلکہ خوف اور شکست کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی خامی وہی ہے جس کی کمی صادق صاحب کی مدھم مدھم شخصیت کا خاص زیور بن گئی ہے۔ صادق صاحب خطرناک ہوں یا نہ ہوں لیکن خطرناک ہرگز معلوم نہیں ہوتے۔ قرہ صاحب اگر ناخن کاٹنے کا چاقو ہاتھ میں لیں، تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کا قتل کر دیں گے۔ صادق صاحب کے ہاتھ میں چمکنے والی خارا شگاف اُن کے مہربان تبسم کی برکت سے موم کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صادق صاحب کی نسبت قرہ صاحب کی قوتِ عمل کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ لیکن ناپختہ جذبات کے پیچھے چل کر یہ قوت خود اپنی ہلاکت کے سامان پیدا کرتی ہے۔ صادق صاحب عمل کریں یا نہ کریں۔ دشمن بنانے کی منفی صفت سب سے بڑی سیاسی متاع بن گئی ہے۔ قرہ صاحب کا دماغ جدلیات کا تربیت یافتہ تو ہے۔ لیکن اس میں استقلال کی تہذیب نہیں آسکی۔ اُن کے دل کے ساتھ پاسبانِ عقل کم ہی دور تک چل کر بعد میں اسے تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن صادق صاحب کی لغزشِ مستانہ میں بھی ان کی پُرکار ہوشیاری کا عنصر غالب رہتا ہے۔

میر تقی میر نے غالب کے بچپن کی تحریریں دیکھ کر کہا تھا کہ یہ بچہ یا تو عظیم سخن گو بنے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ یہ اس بڑی حقیقت کا اظہار ہے کہ زندگی کے بے کیف توازن کے لیے درجۂ اوسط MEDIOCRE کا ہونا لازمی ہے۔ قرہ صاحب پر چاہے اور کوئی الزام لگے، انہیں اوسط درجے کا آدمی نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی الگ الگ صلاحیتیں ہمارے ان امیدواروں سے زیادہ ہیں، جو ان سے زیادہ کامیاب ہیں۔ قسمت کی دیوی اگر اُس پر مسکراتی تو شاید آج اُن کی قوتِ عمل اور تنظیمی صلاحیتوں کے ڈنکے بج رہے ہوتے۔ اُن میں گہرائی نہ بھی ہو، لیکن جو چمک دمک اور تیز دھار ان میں ہے، اُس کا جواب نہیں۔ ایسا آدمی ٹھوکر کھاتا ہے اور لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے۔ بلندی اور پستی کے درمیان اعتدال قائم رکھنے کے لیے مولانا مسعودی کی شانِ بے نیازی چاہیئے۔ قرہ صاحب جیسا زندہ لم یزل لڑھک گیا ہے اور قاب تسبیح اور سجود میں امان ڈھونڈھ رہا ہے۔ انگریزی زبان کے جاسوسی ناولوں کے صفحات میں پیچیدہ ذہن کو ڈھیل دے کر اعصاب کی تسکین کرتا ہے۔ انگریزی فلمیں دیکھنا اور کرکٹ کی کمنٹری سنتا ہے۔ رمی کے داؤ پیچ میں اپنی ذہانت کے کرتب دکھاتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہارتا ہے تو سخت جھگڑتا ہے۔ زندگی کا مات کھایا ہوا تاش کے کھیل میں ہارنے کی رعائت نہیں دے سکتا۔ پاکستان کا معتقد نہ ہوتے ہوئے پاکستان کا حامی ہے۔ صادق صاحب کا رشتہ دار ہونے کے باوجود اُن کا مخالف ہے لیکن پاکستانی ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود صادق صاحب کے ایجنٹ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے شیخ صاحب سے سیاسی ہم آہنگی کے باوجود ان کے عتاب کا شکار ہے اور عوام کے فطری رجحان کے ترجمانی کا جھنجھٹ جھیلنے کے باوجود ان کی نظر میں مشکوک ہے۔ قرہ صاحب کی گتھی یہ ہے کہ وہ اپنی رئیسانہ وضع اور طبعی ہٹ دھرمی کی فیصلوں کے اندر قید ہو کر

رہ گئے ہیں۔ اُن میں اتنا حوصلہ نہیں کہ وہ اپنا سراغ پانے اور اپنا بن جانے کے لیے کوئی بڑا قدم اُٹھائیں ــــ یہ بجھا ہوا الاؤ اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ زندگی کسی طرح فارمولوں کی گرفت میں نہیں آتی اور اسے کامیاب طور پر بسر کرنا کتنا نازک اور کتنا پُراسرار فن ہے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

پیر غیاث الدّین

شخصیت کی تعمیر کے علم اور اس کی تہذیب کے لیے نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے ذہن بنتا ہے۔ جو شخصیت کا پیکر تراشتا ہے۔ خالص علم کے سہارے شخصیت کی گاڑی کچھ دور تو جا سکتی ہے لیکن بہت دور نہیں جا سکتی۔ اس کے پنکچر ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ اور شخصیت کا پنکچر سائیکل کے پنکچر کی طرح آسانی سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ پیر غیاث الدین کو علم کی دولت تو حاصل ہوئی لیکن انہیں ایک صحت مند نقطۂ نظر کی نقدی نصیب نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے بازار میں عین چوراہے پر ان کی شخصیت میں پنکچر ہو گیا۔ اور وہ اُسے علم کے پیوند لگا کر ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پیر غیاث الدین کا ہی المیہ نہیں، کشمیری مسلمانوں کی ایک پوری نسل کا المیہ ہے جو تعلیم کو علم اور علم کو نقطۂ نظر کا SUBSTITUTE سمجھتی ہے۔

پیر غیاث الدین نے اپنی زندگی کا آغاز ایک انقلابی کی حیثیت سے کیا۔ ان کا ذہن نصابی تعلیم پر ہی قانع نہ رہا۔ انقلابی نظریات اور جدید فکری رجحانات کی آماجگاہ بھی بنا۔ اپنی طالب علمی کے دوران ہی میں مارکسزم اور ربلدیاتی مادیت کے فلسفے نے انہیں متاثر کیا۔ علی گڑھ نے یہ رنگ اور گہرا کر دیا۔ خواجہ غلام محی الدین قرہ کی رہنمائی میں غیاث صاحب نیشنل کانفرنس کے ترقی پسند گروپ کے ایک سرگرم رکن بن گئے۔ ۱۹۴۶ء میں کوئٹ کشمیر کی تحریک میں ڈکٹیٹر کی حیثیت سے جیل

گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب مسئلہ الحاق کے سلسلہ میں کشمیر کی کمیونسٹ تحریک ہندو کمیونسٹ اور مسلم کمیونسٹ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ تو غیاث الدین صاحب اپنے ذہنی قائد قرہ صاحب کے ساتھ نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے (یا الگ کر دیئے گئے) ۱۹۵۳ء کے انقلاب میں غیاث الدین صاحب نے "امریکی سازش کو ناکام بنانے کے لیے بخشی غلام محمد کا ساتھ دیا۔ بخشی صاحب کو ان دنوں تنکوں کے سہارے کی ضرورت تھی۔ انہوں نے غیاث صاحب کو پولیٹیکل کالج کا وائس چیئرمین بنا دیا۔ غیاث صاحب سیاسی کارکنوں کو جدلیاتی مادیت کا سبق پڑھانے لگے۔ بخشی صاحب کی اس غیاث افزائی نے غیاث صاحب کے نظریات، معتقدات اور نقطۂ نظر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ غیاث الدین کے اندر کا کارل مارکس طویل چھٹی لے کر کسی صحت افزا مقام پر چلا گیا۔ ان کے انقلابی نظریات کو پھپھوند لگ گئی۔ اور اُن کا انقلابی ذہن انقلابی شش جہات کو بھول کر اپنی ذات میں کھو گیا۔ وہ ایک نئی راہ پر گامزن ہو گئے، ایک نئی منزل کی تلاش میں ..... اس منزل پر پہنچنے کے لیے غیاث الدین صاحب کو نئے سہاروں اور نئے رہبروں کی ضرورت تھی اور یہ سانحہ اتنا المناک تھا کہ کارل مارکس کے اس مرید کو جموں کشمیر کے سب سے بڑے جاہل (جو جاہل مطلق ہی نہیں جاہلِ مطلق العنان بھی تھا) بخشی عبدالرشید کی قیادت نصیب ہو گئی۔ یہ پیر غیاث الدین کی زندگی کا تاریک ترین دور ہے۔ اس دور میں غیاث الدین صاحب نے زندگی کی اعلیٰ اور صالح قدروں کو پامال ہوتے دیکھا اور اُف تک نہ کی۔ انہیں اپنی خاموشی کی قیمت تو مل گئی۔ (وہ لیجسلیٹو کونسل کے وائس چیئرمین ہو گئے) لیکن انہیں متاعِ قلب ونظر سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انہیں کھلونے دے کر بہلایا گیا۔ اور وہ بہلتے رہے۔ رشید صاحب کی صحبت میں افلاطون بھی اُلّو کا پٹھا نظر آتا۔ غیاث الدین صاحب بھی اپنی علمیت اور اپنے تاریخی شعور کو کوڑھ کی بیماری سمجھ کر اس کو چھپاتے رہے۔ مبادا

اس کا اظہار کر کے وہ رشید صاحب کی نظروں میں مشتبہ نہ ہو جائیں۔ آئینہ ساز نے غیاث صاحب کے حلقۂ احباب سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ وہ جاہلوں کی اس فوج کے ایک سپاہی ہیں۔ جو بخشی عبدالرشید کی رہنمائی میں کشمیری عوام سے ان کی شرافت اور خودداری کا انتقام لے رہی ہے۔ لیکن غیاث صاحب سے ایک مفصل ملاقات میں میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ یہ ستمبر ۱۹۶۳ء کا واقعہ ہے۔ غیاث صاحب اور آئینہ ساز ہوائی جہاز کی سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے ایک سٹیشن ویگن میں جموں سے سری نگر کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں غیاث صاحب کھل گئے۔ انھوں نے سیاسیات کشمیر پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ بخشی غلام محمد اور بخشی عبدالرشید کے سیاسی شعور کا تجزیہ کچھ اس انداز سے کیا کہ مجھے حیرت ہونے لگی کہ یہ شخص ابھی تک اس نظام سے کیوں کر وابستہ ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ غیاث صاحب اس نظام سے بڑے متنفر ہیں، لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ پھر کتابوں کی بات چلی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ آدمی خاصا پڑھا لکھا ہے لیکن میرے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ بخشی رشید سے اس کا نباہ کیونکر ہوتا ہو گا؟ غیاث صاحب کے ایک غیر شعوری فقرے سے مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ سٹیشن ویگن کا ڈرائیور جموں کا ایک ڈوگرہ تھا۔ جو غالباً کشمیری زبان سے ناواقف تھا۔ قاضی گنڈ کے قریب پہنچ کر غیاث صاحب نے کہا کہ آج ہم نے بہت باتیں کی ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہو سکا کہ ڈرائیور کشمیری نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ بڑا معنی خیز فقرہ تھا۔ خوف، وحشت اور نامعلوم اندیشوں کے بوجھ تلے غیاث صاحب کا سارا وجود دبا ہوا تھا۔ کارل مارکس سے بخشی عبدالرشید تک کا سفر اتنا آسان نہیں، جتنا بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک پہونچنے کے لیے کئی خون کے جام پینا پڑتے ہیں۔ ضمیر کا خون، اخلاق کا خون اور شعور کا خون۔

پھر اگست ۱۹۶۳ء میں بخشی غلام محمد کو "کامراج" کیا گیا۔ اور کشمیر کے نجات کی ایک موہوم سی امید بندھ گئی۔ میں ان دنوں علی گڑھ میں تھا۔ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دوسرے دن اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ بخشی صاحب کے استعفٰی کے خلاف احتجاج کرنے والوں میں غیاث صاحب پیش پیش تھے۔ مجھے ستمبر ۱۹۶۲ء کا وہ دن یاد آیا۔ جب میں نے غیاث صاحب کی خاکستر میں بغاوت کی کچھ چنگاریاں دیکھی تھیں۔ جب میں نے اس کی آنکھوں میں اس نظام کے خلاف نفرت کے شعلے چمکتے دیکھے تھے۔ جسے قائم رکھنے کے لیے آج وہ پھر نعرے لگا رہا تھا۔ غیاث نے صرف نعرے ہی نہیں لگائے۔ اس نے اس نظام کو زندہ رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ وہ شطرنج کی بازی تو جیت گیا، لیکن زندگی کی بازی ہار گیا۔ وہ سہ ماہی مزاحیہ وزارت میں وزیر بن گیا۔

لینن کا پرستار اور مارکس کا معتقد بخشی رشید کی شطرنج کا ایک مہرہ بن گیا۔ غیاث الدین کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ مسلم انٹیلیکچولز کا نمائندہ ہے اور وہ بڑے فخر اور یقین کے ساتھ اپنی اس حیثیت کا ذکر کرتا ہے۔ اسے کوئی کیونکر بتائے کہ انٹیلیکچولز کو اس کے مسلم ہونے پر شبہ ہے اور مسلمانوں کو اُن کے انٹیلیکچوئل ہونے پر۔ اُسے انٹیلیکچوئل بننے سے پہلے اپنی شخصیت کے پنچروں کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ اس میں بہت کچھ بننے کی صلاحیتیں ہیں، لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کا سہارا لینے کی بجائے دوسروں کی حماقتوں کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ کامیابی کی راہ طویل ہے۔ میکدے کے آداب SHORT CUT سے گذر کر منزل کو نہیں پایا جا سکتا، غیاث بلانوش ضرور ہیں، لیکن رند بننے کے لیے کچھ آداب مقرر ہیں۔ اور یہ آداب جاننے کے لیے ایک صحت مند نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

پریم ناتھ بزاز

یہ ستمبر ۱۹۶۸ء کی بات ہے کہ سری نگر کے مجاہد منزل میں اسٹیٹ پیپلز کنونشن کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مجاہد منزل کا ہال ڈیلی گیٹوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور پنڈت پریم ناتھ بزاز اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ سامعین بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ بزاز صاحب کے ارشادات سن رہے تھے۔ اور میں بے خیالی کے عالم میں اونگھ رہا تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک بزرگ (جو میرے استاد رہ چکے ہیں) نے جھنجھوڑ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"سن رہے ہو اس بے ایمان کی خرافات۔

"جی ہاں، سن رہا ہوں" میں نے اپنے ہونٹوں پہ ایک مصنوعی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے شیخ صاحب کو اس بے ایمان کشمیری پنڈت سے بچاؤ، اسی خبیث نے اسے پہلے بھی تباہ کر دیا اور پھر نہ معلوم اسے کیا پٹی پڑھانے آیا ہے۔" بزرگ استاد نے اپنے شاگرد کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے بہت سے کشمیری پنڈتوں کی زبانی پریم ناتھ بزاز کی "بے ایمانی" اور "خیانت" کے قصے سن چکا تھا۔ اور مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ کشمیری پنڈت بزاز صاحب کو اپنا دشمن نمبر ایک تصور کرتے ہیں۔ اب اپنے استاد کی زبانی بزاز صاحب

کی تعریف سن کر میں یہ سوچنے لگا کہ ان کی ذات میں وہ کونسی "خوبی" ہے کہ ان سے ہندو اور مسلمان دونوں ہی ناخوش اور بیزار ہیں۔ پریم ناتھ بزاز کی زندگی، اس سوال کا جواب بھی ہے۔ اور ان کی "بے ایمانی" کا جواز بھی! کشمیر کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں صوفی نذیر احمد جیسے "ایماندار" تو بہت ہیں۔ لیکن پنڈت پریم ناتھ بزاز جیسے بے ایمان کم اور غالباً اسی لیے جب تک "ایمانداروں" اور بے ایمانوں کا یہ عدم توازن برقرار رہے گا کشمیر کی تاریخ اور تقدیر الجھی رہے گی!

بزاز صاحب کو ان کی روشنیٔ طبع مار گئی ہے۔ عین ان دنوں جب وہ لڑکپن سے جوانی کی سرحدوں میں داخل ہو رہے تھے، کسی طرح ان کے ذہن کی کھڑکی کھل گئی اور جب یہ کھڑکی کھل جاتی ہے تو پھر آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ اسی لیے بزرگ، ہمدرد اور بہی خواہ اکثر اس کھڑکی کو بند رکھنے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ لیکن بزاز صاحب نے کسی کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ کھڑکی کھل گئی تو اسے کھلا ہی رہنے دیا اور نتیجہ یہ کہ ساری دنیا سے مار کھاتے رہتے ہیں لیکن وہ صرف مار کھاتے ہی نہیں، موقع ملتے ہی زمانے کو بھی دو ایک ہاتھ مار دیتے ہیں۔ انہوں نے ابھی ہتھیار نہیں ڈالے ہیں۔ اور میرا اپنا خیال ہے کہ وہ مرتے دم تک لڑتے رہیں گے یہ ان کی زندگی کا حاصل ہے!

یہ کشمیری پنڈتوں کی بدنصیبی ہے کہ پریم ناتھ بزاز ۱۹۰۵ء میں سری نگر کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ اگر کسی مسلمان کے گھر میں جنم لیتے تو کشمیری پنڈت بڑے فائدے میں رہتے۔ کیونکہ پھر کشمیری پنڈتوں کو یقیناً بزاز کی ہمدردیاں حاصل ہو جاتیں۔ وہ ساری دنیا سے لڑ جھگڑ کر کشمیری پنڈتوں کی بے چینی، بے زاری، اور نا آسودگی کا علاج ڈھونڈتے پھرتے۔ لیکن زندگی اور موت پر چونکہ کسی کا اختیار نہیں، اس لیے بزاز صاحب ایک کشمیری برہمن کے ہاں پیدا ہوئے۔ ایس۔ پی۔ کالج میں تعلیم پائی۔ اور ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔ ابتدا

میں طبقہ نسواں کے فلاح وبہبود سے دل چسپی لینا شروع کی۔ رفتہ رفتہ سیاست کی دیوی نے اپنا پر توڑ ڈالنا شروع کر دیا اور ۱۹۳۱ء میں سناتن دھرم یووک سبھا کے صدر منتخب ہو گئے۔ اسی سال کشمیری مسلمانوں کی نیند بھی کھلنے لگی اور مہاراجہ نے انہیں پھر سُلانے کے لیے گلانس کمیشن کا تقرر عمل میں لایا۔ بزاز صاحب کو کشمیری پنڈتوں کے نمائندے کی حیثیت سے اس کمیشن کا غیر سرکاری ممبر نامزد کیا گیا۔ گلانس کمیشن کی ممبری ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہو گیا۔ وہ نامزد تو ہوئے تھے۔ کشمیری پنڈتوں کی نمائندگی کرنے کے لیے، لیکن انہوں نے روشن طبعی کے ہاتھوں مجبور ہو کر انسانیت اور انصاف کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیا۔ کشمیری پنڈت ہوتے ہوئے انہوں نے کشمیری مسلمانوں کی زبوں حالی، پس ماندگی اور ان سے روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کے خلاف احتجاج کیا۔ گلانس کمیشن کی رپورٹ میں مسلمانوں کو ان کے حقوق نہیں بلکہ کچھ مراعات دی گئی تھیں، لیکن اس کے شائع ہوتے ہی کشمیری پنڈت حلقوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوا اور پنڈت پریم ناتھ بزاز اپنے ہم مذہبوں کی نظروں میں ہدفِ ملامت ہی نہیں، گردن زدنی قرار پائے۔ ان کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے ان کی بے عزتی اور بے حرمتی کی گئی۔ اور کشمیری پنڈت برادری میں ان کا 'دانہ پانی' بند کر دیا گیا۔ پنڈت بھائی آج ۴۸ سال بعد بھی بزاز صاحب کی اس 'خباثت' اور 'بے ایمانی' کو نہیں بھولے ہیں۔ اور نہ غداری کے لیے انہیں معاف کیا ہے، کرتے بھی کیسے۔ بزاز صاحب نے اس کے بعد بھی کئی بار اپنی برادری کے مفادات کو زک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

بزاز صاحب ۱۹۳۲ء سے برابر آزادی، جمہوریت اور سیکولرازم کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ کہ جب آزادی کی نیلم پری نے اپنا جلوہ دکھایا۔ بزاز کے مقدر میں قید و بند اور جلاوطنی لکھی گئی اور وہ آج ۲۲ سال سے کشمیر چھوڑ کر

دلی میں رہ رہے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے "وتستا" جاری کر کے کشمیر میں صحافت کی داغ بیل ڈال دی۔ پھر ہفت روزہ "ہمدرد" شروع کر کے اسے گھٹنوں کے بل چلنا سکھایا اور ۱۹۴۳ء میں ہمدرد کو روزنامے کی شکل دے کر اردو صحافت کو نئی وسعتیں بخشیں۔ "ہمدرد" کی تاریخ ہماری صحافت ہی نہیں، سیاست کی بھی تاریخ ہے اور اس کے مطالعے سے بہت سے ان تاریک گوشوں پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے جنہیں امتدادِ زمانہ نے نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔

۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کا فیصلہ تاریخی تقاضوں اور بدلے ہوئے سیاسی حالات کا نتیجہ تھا لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس تاریخی عمل کو تیز تر کرنے اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کا سہرا بہت حد تک پنڈت پریم ناتھ بزاز کے سر رہے گا۔ اُنہوں نے ہی شیخ صاحب کو اس "شجر ممنوعہ" کو چکھنے کی ترغیب دی اور انہیں کشمیر کے گاندھی کا خطاب دے کر ان کے دل میں ہزاروں تمنائیں بیدار کر دیں۔ لیکن بزاز صاحب کو جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ شیخ محمد عبداللہ ان کے ساتھ زیادہ دور تک نہیں جا سکتے۔ دونوں کے درمیان مزاج، ذہن، فکر اور عقائد کی بہت بڑی خلیج حائل تھی۔ بزاز ایم۔ این۔ رائے کے مقلد تھے اور شیخ صاحب قوم پرستی کا راستہ اختیار کرنے کے باوجود کٹر قسم کے مسلمان۔ ۱۹۴۱ء میں بزاز نیشنل کانفرنس سے مستعفی ہو گئے اور سوشلسٹ پارٹی کے نام سے ایک جماعت قائم کی، اس کے بعد بزاز اور شیخ صاحب کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ جو مدھم سروں میں آج بھی جاری ہے۔ اس جنگ میں کون جیتا کون ہارا؟ اس کا فیصلہ بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ بات بزاز صاحب کے حق میں کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ باوجود اس کے کہ اس مقابلے میں کئی بار ان کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے دوران

خواجہ غلام محی الدین قرہ نے پریم ناتھ بزاز کو ہلاک کرنے کے لیے ان پر گولیاں چلوا دیں، اور وہ شدید زخمی بھی ہو گئے۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب شیخ صاحب اور ان کے ساتھی بر سر اقتدار آئے تو بزاز صاحب کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی حمایت کے الزام میں گرفتار ہو گئے۔ وہ تین سال تک جیل میں رہے اور رہائی کے ساتھ ہی انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دلی کو اپنی "تخریبی" سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور کشمیر ڈیموکریٹک یونین کے نام پر جمہوریت، عقلیت اور سیکولرازم کو فروغ دینے کی کوشش کرتے رہے، لیکن غریب الوطنی میں صرف جمہوریت اور سیکولرازم کا پرچار کرنے سے ہی انسان کا پیٹ نہیں پلتا، پھر ان کا اپنا ہی پیٹ نہ تھا۔ آدھ درجن بچوں اور بیوی کا پیٹ بھی تھا۔ اس لیے انہوں نے فارموکیٹوٹیکل میگزین کے نام سے ایک چھوٹا سا رسالہ جاری کیا۔ سیاست اور فارمیسی کا بظاہر کوئی رشتہ نہیں، لیکن پیٹ کی خاطر ان دونوں میں تعلق قائم کرنا پڑا۔ صحافت میں بزاز صاحب کا تجربہ کام آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ رسالہ چل نکلا اور بزاز کا سارا خاندان اس میں ملازم ہو گیا۔ اب ان کے پاس اپنا ایک پریس ہے۔ خوبصورت مکان ہے۔ ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر ہے اور ان کا فارموکیوٹیکل میگزین ہندوستان میں فارمیسی کا سب سے بڑا رسالہ ہے۔ اب بزاز صاحب کی جگہ ان کے ہونہار فرزندوں نے لی ہے۔ لیکن وہ اب بھی بدستور اپنے وقت کا کچھ حصہ پریس اور میگزین کی تنظیم و ترتیب میں صرف کرتے ہیں۔ اس دوران میں بزاز صاحب نے عملی سیاست میں تو حصہ نہیں لیا۔ لیکن کشمیر کی تحریک آزادی پر ایک مبسوط کتاب لکھ ڈالی۔ اس کے علاوہ "وِتستان کی بیٹیاں" اور "کشمیر ان کروسی بل" کے عنوان سے بھی ان کی دو مفید اور اہم کتابیں چھپ چکی ہیں۔ پمفلٹ شائع کرنے کا تو انہیں جنون ہے

اور ہر اہم موضوع پر وہ جب تک پمفلٹ کے ذریعے اپنی رائے ظاہر نہ کریں۔ ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

پریم ناتھ بزاز یوں تو صرف بی۔ اے پاس ہیں، لیکن سیاست، تاریخ، سماجیات اور اخلاقیات کے بڑے بڑے "ڈاکٹر" ان کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ وہ خدا اور مذہب پر یقین نہیں رکھتے، لیکن خدا کے بندوں اور مذہب پر یقین رکھنے والوں سے انہیں بے حد انس ہے۔ ان کے خیال میں افہام و تفہیم سے دنیا کا ہر مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ عقلیت کو اپنا مسلک اور انسان دوستی کو اپنا مذہب قرار دیتے ہیں۔ وہ تعصب کے دشمن اور تشکیک کے پیغمبر ہیں اور کشمیر کی سیاسی تاریخ نے ابھی تک ان کا جواب پیدا نہیں کیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انسان بنیادی طور پر عقل پرست اور منطق پسند ہے اور اپنے اس دعویٰ کی صحت پر انہیں اس درجہ اعتقاد ہے کہ ان کی اپنی عقلیت اور منطق پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ انسانی تاریخ کے بہت سے انقلابات انسان کی نامعقولیت، حیوانیت اور بہیمیت کی پیداوار ہیں۔ اور انسان بجائے خود ایک محشر خیال ہے، کہ اسے صرف عقل و منطق کے فارمولوں کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا۔ عقل و منطق پر اس غیر معمولی اصرار نے پنڈت پریم ناتھ بزاز کو ایک اچھا انسان اور ایک ناکام سیاستداں بنا دیا ہے۔ سیاسی طور پر ان کی ساری زندگی ناکامی اور نامرادی کی ایک المناک داستان ہے اور وہ اپنی بے پناہ ذہنی صلاحیتوں کے باوجود تحریک حریت میں کوئی نمایاں رول ادا نہیں کر سکے ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ افراد کو متاثر کر سکتے ہیں، لیکن اجتماع کی قیادت نہیں کر سکتے اور سیاسی زندگی میں کامیابی کے لیے ہجوم کو اپنے ہمراہ لے چلنا بہت ضروری ہے۔ پریم ناتھ بزاز کے بہت سے اندازے غلط ثابت ہو گئے اور

ان کی غفلت نے انہیں کئی بار دھوکے دیئے، لیکن وہ اپنی حکمت کے خم و پیچ میں کچھ اس قدر الجھے رہے کہ ابھی تک "فیصلۂ نفع و ضرر" نہیں کر پائے ہیں۔ نیشنل کانفرنس سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنی ساری زندگی شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کی دشمنی میں گذار دی۔ کسان کانفرنس کی تنظیم اور عبدالسلام ایتو کی تخلیق بزاز صاحب کی عملی سیاست کے دو "شاہکار" نمونے ہیں جو تاریخ کی بھول بھلیوں میں کھو کر ہمارے ذہن سے اتر چکے ہیں۔ لیکن بزاز صاحب نے اپنی کتاب "دی ہسٹری آف سٹرگل فار فریڈم ان کشمیر" میں ان کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے، کہ جیسے تحریک حریت ان ہی سے عبارت ہو، بزاز صاحب انتہا پسندی کے سخت مخالف ہیں، لیکن شیخ محمد عبداللہ کی دوستی اور دشمنی دونوں میں ہی انہوں نے انتہا پسندی سے کام لیا۔ دوستی پر آئے تو انہیں کشمیر کا گاندھی کہہ کر یاد کیا۔ دشمنی پر آئے، تو انہیں کشمیر کا قاتل قرار دیا۔ کشمیر چھوڑ دو تحریک کے دوران پریم ناتھ بزاز نے اپنے اخبار "ہمدرد" کے ذریعے شیخ محمد عبداللہ کو ہی نہیں پوری تحریک کو غنڈوں اور ناپسندیدہ عناصر کی تحریک قرار دیا۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ بزاز صاحب نے صحافتی معیاروں کو خیر باد کہہ کر میر عبدالعزیز (ایڈیٹر "انصاف" راولپنڈی) کے قلم سے ایسی مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں لکھوائیں کہ خواجہ غلام محی الدین قرہ کو بزاز صاحب پر گولی چلانا پڑی! پریم ناتھ بزاز کی عظمت یہ ہے کہ وہ ریاکار اور مصلحت پسند نہیں۔ وہ بت تراش بھی ہے اور بت شکن بھی، لیکن وہ بت پرست نہیں، جب اُن کا دل اور ضمیر کسی بات کی صداقت کو تسلیم کرتا ہے تو وہ دنیا کی پروا کیئے بغیر اس صداقت کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں وہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے زبردست حامی تھے اور اپنے اس عقیدے کی بنا پر اُنہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت

کیں اور وہ دلی میں بیٹھ کر بھی کشمیر کے لیے حق خود ارادیت کا مطالبہ کرتے رہے
اب ان کی فکر اور ان کی سوچ میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ وہ
پاکستان سے مایوس ہیں اور ان کے خیال میں کشمیر ہندوستان کے ساتھ رہ کر
بھی حق خود ارادیت کی منزل پا سکتا ہے۔ اپنی تازہ کتاب "کشمیر ان کروسی بل"
میں اُنھوں نے کشمیر کے لیے مکمل اندرونی خود مختاری کا حل تجویز کیا ہے۔ پریم ناتھ
بزاز کی اسی ذہنی اور فکری تبدیلی کو کچھ لوگ ان کی "بے ایمانی" سے تعبیر
کرتے ہیں۔ لیکن بزاز صاحب کو اس کی پرواہ نہیں۔ کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ وہ اپنے
آپ کو صرف اپنے ضمیر کی عدالت کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا
میں کوئی پتھر یا درخت ہوں، کہ میری فکر اور سمجھ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی۔

شیخ محمد عبداللہ اور بزاز صاحب میں ایک ہی قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں
کو کشمیر سے والہانہ عشق ہے۔ بزاز صاحب نے کشمیر کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے
اور وہ اسے ایک بار پھر علم و تہذیب کا گہوارہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کے
سخت مخالف ہیں کہ کشمیری عوام کو ان کی مرضی کے خلاف ہندوستان کے ساتھ
وابستہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔

ان کے خیال میں کشمیری مسلمانوں کو ہندوستان کے ساتھ رہنے پر رضامند
کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ خیال صحیح ہے یا نہیں؟ اس پر دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔ اُن
کا تازہ ترین کارنامہ "اسٹیٹ پیپلز کنونشن" ہے۔ یہ بہت حد تک ان ہی کے ذہن
اور فکر کی پیداوار ہے، لیکن تاریخ گواہ ہے، کہ وہ ہر سیاسی تنظیم یا انجمن جس کے
ساتھ وہ وابستہ رہے ہیں، زیادہ دیر تک نہیں چلتی۔ اس لیے اسٹیٹ پیپلز کنونشن
کے متعلق بھی زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔

(سالنامہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء)

راجپوری صاحب

راجپوری صاحب پر لکھنے بیٹھا ہوں، تو ایک عجیب الجھن میں گرفتار ہوں، اس لیے نہیں کہ کیا لکھوں، بلکہ اس لیے کہ کیا کیا لکھوں۔ ان پر کتاب لکھنا آسان ہے، لیکن ان کی شخصیت کے بحر بیکراں کو آئینہ کے دو یا تین کالموں میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ انہیں کسی عنوان کے تحت جگہ دے کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ وہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے منفرد اور اپنی سیاست کے اعتبار سے "مجرد" ہیں۔ وہ ایک مہذب وحشی اور اشتراکی سرمایہ دار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی میں کسی قسم کے تضاد کا احساس نہیں ہوتا۔

راجپوری صاحب سرینگر سے ۲۵ میل کے فاصلے پر راجپورہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں ہوئی، جہاں قرآن مجید کے علاوہ سعدی کی گلستاں، بوستاں بھی نصاب میں شامل تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر پھر باقاعدہ تعلیم شروع کر دی (راویوں کا کہنا ہے کہ وہ تیرہ سال کی عمر میں جماعت اول میں داخل ہوئے) ان دنوں راجپورہ میں اس دور کے مشہور رئیس حسّہ لال کا سکّہ چلتا تھا، ان کی امارت، شان و شوکت اور دبدبہ سے متاثر ہو کر راجپوری کے دل میں بھی رئیس اعظم بننے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔ لیکن رئیس بننا اتنا آسان نہیں، جتنا آسان انقلابی بننا ہے۔ اس لیے راجپوری صاحب انقلابی ہو گئے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ کچھ دیر صحرانوردی کرتے رہے۔ اور اسی دوران میں مارکسزم

میں انہیں حسہ لال کو ختم کرنے کی سبیلیں نظر آئیں۔ اس لیے انھوں نے فکری طور پر یہ فلسفہ اپنا لیا۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ گئے اور ایل، ایل، بی کا امتحان پاس کرلیا۔ ان دنوں علی گڑھ سے آیا ہوا ہر نوجوان قومی تحریک کے ہراول دستے میں بھرتی ہو جاتا۔ راجپوری صاحب بھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ عملی سیاست میں شریک ہو گئے۔ لیکن ان کی سیاست ریاست کے جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے سے زیادہ راجپورہ کے امپریلیزم کا تختہ الٹنے پر ہی مرکوز رہی۔ اس دوران میں ملک آزاد ہوگیا، اور نیشنل کانفرنس کی "آموزدہ قیادت" برسر اقتدار آگئی۔ راجپوری صاحب اپنے تجربے اور قربانیوں کے اعتبار سے نو وارد تھے۔ اس لیے انہیں اقتدار کی بندر بانٹ میں مناسب حصّہ نہ مل سکا۔ ایک روایت ہے کہ شیخ صاحب نے اُن کی جسمانی ساخت کے پیش نظر انہیں سپرنٹنڈنٹ پولیس بنانے کی پیشکش کی تھی، لیکن راجپوری صاحب نے اسے ٹھکرا دیا۔ انہی دنوں راجپورہ میں خواجہ غلام محی الدین قرہ کا بے نظیر اور عدیم المثال اِستقبال کیا گیا اور نیشنل کانفرنس کی ہائی کمان نے راجپوری صاحب کو اِس جرم میں ماخوذ کر کے نیشنل کانفرنس سے الگ کر دیا۔ اس کے بعد راجپوری صاحب نے راجپورہ کو خیرباد کہہ کر شوپیان میں وکالت شروع کر دی۔ اور یہیں آئینہ ساز نے ان کی شخصیت کے افسانے کا قریب سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ وکالت تو راجپوری صاحب کے بس کا روگ نہ تھا، لیکن شوپیان کی سیاست پر وہ چھا گئے، ان کی حیثیت ایک بزرگ رہنما کے طور پر تسلیم کی گئی اور راجپوری صاحب نیشنل کانفرنس کے دونوں "دھڑوں" کی وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء کے انقلاب کے بعد راجپوری صاحب شوپیان سے سرینگر منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ ترقی پسندی سے تو غافل ہو گئے، لیکن ترقی کے زینے طے کرتے رہے۔ انہوں نے "کشمیر میں سامراجی سازش" کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی، اور جب بخشی عبدالرشید کو نیشنل کانفرنس پر

پر مسلط کیا گیا، تو ان کی قیادت کو بھی قبول کیا۔ یہی نہیں وہ رشید صاحب کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے مارکس اور اس کے معاشی فلسفے کو بھی بھول گئے۔ ۱۹۵۷ء کی کشمکش میں انھوں نے بخشی سامراج کا ساتھ دیا اور منسٹر ہو گئے۔ ان کا عہد وزارت ان کی زندگی کا زریں باب ہے۔ حسنہ لال کے محلات کی چھاؤں میں بیٹھ کر راجپوری صاحب نے جو خواب دیکھے تھے یہ ان کی تعبیر کا زمانہ تھا۔ انہوں نے اپنے لیے محل بنائے، کاریں خریدیں اور روپیوں کی جھنکار سے اپنی نا آسودگی سے انتقام لیا۔ ایک اطلاع کے مطابق راجپوری صاحب کا شمار اب رئیسان کشمیر میں ہوتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں راجپوری صاحب وزیر اعظم ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ان کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ وہ وزیر اعظم ہونے کی ریہرسل بھی کر چکے تھے۔ لیکن بخشی صاحب ان پر اعتماد کرنے کے باوجود ان سے ہمیشہ خائف تھے۔ اس لیے عین وقت پر دغا دے گئے۔ سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ غلام محمد صادق کو بخشی غلام محمد کا جانشین منتخب نہ کیے جانے کا سہرا بھی راجپوری صاحب کے سر ہے۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں راجپوری صاحب خواجہ غلام محمد صادق اور سید میر قاسم ہی کے نہ چاہنے کے باوجود راجپورہ کے حلقۂ انتخاب سے بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ اشوک کمار نامی اداکار نے ایک ہی کرتب میں راجپوری صاحب کے امیدواروں کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ اور راجپوری صاحب نے ایک زوردار قہقہے کے ساتھ اپنی فتح کا اعلان کر دیا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد صادق صاحب نے انہیں قانون ساز اسمبلی کا سپیکر نامزد کر کے اپنی جماعت کے "فرشتوں" کو حکم دیا، کہ وہ ان پر ایمان لائیں۔ ساری جماعت میں ایک بھی "ابلیس" نہ تھا، جو انکار کرتا ۔ راجپوری صاحب سپیکر ہو گئے۔ اور ٹھیک دو سال تک سپیکر رہے اس دوران میں ہارے ہوئے جواری (غلام قادر میر، محمد شفیع سمنانی) ہاری ہوئی بازی جیتنے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر جسٹس اننت سنگھ نے راجپوری

صاحب کی پُراسرار کامیابی سے پردہ ہٹا کر ان سے سپیکری کا تاج چھین لیا۔ ان کا انتخاب کالعدم قرار پایا۔ ضمنی انتخاب میں راجپوری صاحب نے ایک بار پھر زور لگایا۔ لیکن پانسہ پلٹ چکا تھا۔ پہلی بار سرکاری مشینری نے ان کے خلاف منظم ہو کر کام کیا اور راجپوری صاحب ہار گئے۔ کچھ دنوں کے لیے وکالت میں زور آزمائی کی۔ لیکن دل تو سیاست میں اٹکا ہوا تھا، اس لیے زیادہ دیر تک نہ ٹک سکے۔ آجکل ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کی فکر میں ہیں۔ اور اپنے اخبار "جہان نو" کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کی تشہیر کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ کونسی دُکان زیادہ سود مند رہے گی۔ صحافت کی یا سیاست کی؟ ان کا خیال ہے کہ دونوں ہی دکانیں چلا سکیں گے۔ انہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ ان کا اندازہ غلط ہے۔

(رسالنامہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء)

کارصاحب

کئی سال کی بات ہے کہ میں اور موتی لال مصری علی گڑھ میں کچھ غیر کشمیری طلبار کی موجودگی میں کشمیر کی سیاسی شخصیات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کہ باتوں باتوں میں کارصاحب کا تذکرہ چھڑ گیا۔ کارصاحب کا نام سنتے ہی یو۔پی کے ایک دوست اُچھل پڑے ___ یہ کارصاحب کیا چیز ہیں؟ کیا ان کے پاس بہت سی کاریں ہیں؟ پھر تو آپ کے ہاں سائیکل صاحب، موٹر صاحب، تانگہ صاحب اور لاری صاحب بھی ہوتے ہوں گے۔ مصری صاحب میں بات بات پر قہقہہ لگانے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ انھوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور میں اپنے فرائض نبھانے لگا۔ یعنی بقول بخشی عبدالرشید "حقیقت بیانی" کرنے لگا۔

غلام رسول کار کی ابتدائی زندگی دنیا کے اکثر بہت بڑے آدمیوں کی طرح بڑی عسرت اور تنگدستی میں گذری ہے۔ انھوں نے زندہ رہنے کے لیے گلی کوچوں میں اخبار بیچے ہیں۔ محنت مزدوری کی ہے اور زندگی کی اس کشمکش میں ہاتھ پیر مارتے مارتے سیاست کی وادی میں بھی گھس گئے، اور بقول کارصاحب بہت دنوں تک علاقہ سوپور کے خالد کشمیر صوفی محمد اکبر کے "بستہ بردار" بھی رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں جیل جانے کے بعد وہ صوفی صاحب کے اثر سے نکل کر مولانا مسعودی اور بخشی غلام محمد کے زمرۂ خاص میں شامل ہو گئے۔ مولانا اور بخشی دونوں ہی مردم شناس

واقع ہوئے ہیں (اسی لیے دونوں ایک دوسرے کو بھی اچھی طرح سے جانتے تھے)
کار صاحب کے جوش وخروش جذبۂ عمل، عقائد کی صحت اور اُن کی صلاحیتوں
کا اندازہ کرکے انہیں نیشنل کانفرنس میں سنجیدگی سے لیا جانے لگا۔ ۱۹۵۱ء میں
انھیں سوپور سے آئین ساز اسمبلی کا ممبر قرار دیا گیا۔ اس کے بعد وہ سوپور ٹاؤن
ایریا کمیٹی کے چیئرمین ہو گئے۔ ان کی چیئرمینی کا دور اُن کے لیے فائدہ مند اور اہلِ
سوپور کے لیے تکلیف دہ (نقصان دہ) ثابت ہوا۔ کوآپریٹو سے بھی ان کا
تعلق اہلِ سوپور کے لیے فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ مختصراً یہ کہ تجارتی اور انتظامیہ
اُمور میں وہ نسبتاً کم کامیاب رہے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ شیر کشمیر پر فدا ہوتے ہوتے
رہ گئے۔ بعض مقربینِ خاص کا کہنا ہے کہ انھیں شیخ صاحب کی گرفتاری کا
اتنا قلق ہوا کہ بہت دنوں تک گھر سے باہر ہی نہ آئے (اُن کے دشمنوں کا کہنا ہے
کہ روپوش تھے)۔

۱۹۵۳ء کے بعد وہ سوپور میں بخشی صاحب کے خاص آدمی شمار کئے جانے لگے۔ وہ شدید طور پر
انٹی کمیونسٹ تھے اور برابر ۱۹۵۶ء تک "ترقی پسندوں" کے مقابلے میں "غیر" "ترقی پسندانہ" رول
نبھاتے رہے۔ استحصالی سماج اور سامراجی طاقتوں میں تضادات کا نمایاں ہونا
ناگزیر ہے۔ بخشی صاحب صرف ایک آدمی پر بھروسہ کرنا خطرناک سمجھتے تھے۔ وہ ایک
انسان کے پَر کاٹنے کے لیے ہمیشہ دو ایک اور انسانوں کو میدان میں چھوڑ دیتے
تھے۔ سوپور کے مشہور "اہل زبان" عبدالغنی ملک سے کشمکش نے کار صاحب
کو بخشی صاحب سے الگ کرکے ترقی پسند حلقوں میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد
کار صاحب نے "ترقی پسندوں" سے وہ وفاداری نبھائی کہ وہ صادق صاحب کے معتمد اور ڈی۔ پی صاحب
کے یارِ غار بن گئے۔ ۱۹۵۷ء میں بخشی صاحب نے کار صاحب کا پتہ کاٹنے
کی کوشش کی۔ لیکن صادق صاحب ان کے آڑے آئے اور انہیں اسمبلی کا ٹکٹ

مل گیا۔ کار صاحب نے "وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے" کے مصداق صادق صاحب اور ترقی پسندوں کے تئیں جس خلوص اور قربانی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے عبدالرحمٰن راحت اور غلام رسول رینزو کے دیئے ہوئے زخموں کو کسی حد تک مندمل کر دیا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بخشی غلام محمد نے کار صاحب کو خریدنے کے لیے کیا کیا لالچ نہ دیئے لیکن کار کے عزم و استقلال میں کمی نہ آئی۔ وہ پٹتے رہے اور جب کبھی موقع آیا اوروں کو بھی پیٹتے رہے۔ جب صادق صاحب اور ان کی جماعت کا مستقبل انتہائی تاریک تھا۔ کار صاحب نے جب بھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہ اُن کے عقائد کی سلامتی سے زیادہ اُن کے جذبۂ وفا کا کرشمہ تھا۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں کار صاحب نے خالص کمیونسٹ طریق کار کو اپناتے ہوئے اپنے مخالف اُمیدوار اور اس کے تجویز کنندگاں کو پراسرار طور پر غائب کر دیا۔ اور بلا مقابلہ کامیاب ہوگئے۔ صادق صاحب کے برسر اقتدار آنے کے بعد وہ بہت دن تک صادق صاحب اور ڈی پی صاحب کے پاس سفارشیں کرتے رہے۔ اس دوران صادق صاحب کو یہ احساس ہوگیا کہ کار صاحب کو ان کی مسلسل قربانیوں اور وفاداری کا صلہ ملنا چاہیئے اور انھیں منسٹر آف سٹیٹ بنا دیا گیا۔

کار صاحب نے منسٹر آف سٹیٹ کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا۔ موجودہ وزارت میں اُن جیسا باعمل، متحرک اور قوت فیصلہ رکھنے والا کوئی وزیر نہیں ہے۔ انھوں نے اس قلیل عرصے میں یہ ثابت کر دیا کہ وزیر ہونے کے لیے بامحاورہ انگریزی بولنا ضروری نہیں۔ ہمت، حوصلے اور محنت سے اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اپنے طریق کار میں بخشی غلام محمد کی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یعنی دفتری طوالت اور بیوروکریٹک اندازِ گفتگو کی بجائے فوری احکامات اور

دیہاتی لب و لہجے کے کھردرے پن پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ شروع میں ہماری بیوروکریسی نے اس "اکھڑ دیہاتی" کو سنجیدگی سے قبول کرنے سے احتراز کیا، لیکن کار صاحب نے اپنے بے پناہ قوتِ ارادی سے بیوروکریسی کے ہاتھی کو زیر کر لیا ہے۔

موسمِ سرما کی تخ بستہ ہواؤں سے گھبرا کر جب حکومت نے جموں میں پناہ لی، تو کار صاحب تنِ تنہا سری نگر میں ان حوادث کا مقابلہ کرتے رہے۔ جو موسم کی بے اعتدالیوں اور سیاست کی محشر خرامیوں کی پیداوار تھے۔ وہ ہاتھ میں بیلچہ لے کر سڑکوں سے برف اٹھاتے رہے اور لوگوں کو کشمیر کے سب سے بڑے اداکار بخشی غلام محمد کی یاد دلاتے رہے۔ کشمیر کے لوگوں کو بخشی کی یہ ادا پسند تھی۔ کار صاحب یہ جانتے تھے اس لیے انہوں نے حکومت کے قلعے کو مضبوط بنانے کے لیے "تقلید" سے بھی گریز نہ کیا۔ لیکن اب یہ بات بہت پرانی ہو گئی ہے۔ آجکل کار صاحب حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں "سینہ زوری" کے بعد ایک بار پھر وزیرِ مملکت ہو گئے۔ مگر اب کی بار وہ پہلی سی بات نہ تھی۔ صادق صاحب ان سے ناخوش ہی نہیں بیزار بھی تھے۔ رفتہ رفتہ کار صاحب کی "کارپردازی" رنگ لانے لگی۔ ان کے خلاف بے پناہ دولت جمع کرنے کے الزامات عائد ہونے لگے، ان کی دراز دستیوں کے چرچے عام ہونے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کار صاحب اقتدار کی اونچائیوں سے لڑھکتے ہوئے نظر آنے لگے۔ صادق، قاسم اختلافات کی آگ بھی اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ اس کشمکش میں کار صاحب نے ڈی۔ پی۔ در اور قاسم صاحب کا ساتھ دیا اور نتیجہ یہ کہ پچھلے سال انہیں وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اور جب سے وہ مستعفی ہو گئے ہیں۔ انہیں یہ احساس شدت کے ساتھ ستا رہا ہے کہ "نیا کشمیر" کے تعمیری پروگرام کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ دراصل وہ "نیا کشمیر" تعمیر کرنے کے لیے ایک بار پھر وزیر بننا چاہتے ہیں۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

شمہ صاب

سٹیفن زوگ نے میری اینٹنی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ایک چھوٹی عورت تھی، جو ایک بہت بڑے تاریخی رول کے لیے منتخب ہوئی۔ شمہ صائب کے بارے میں یہی بات ان الفاظ میں کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک شریف آدمی ہیں اور ان کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش کی گئی۔ اس کوشش میں کوئی اور زخمی ہوا یا نہیں لیکن شمہ صائب کا کندھا خاصا مجروح ہوگیا۔

آئینہ ساز شمہ صائب کو جب سے جانتا ہے جب وہ شمس الدین تھے اور اس کے ساتھ مشاعروں میں بیٹھ کر ہوٹنگ کیا کرتے تھے۔ جب شمہ صاب میں کوئی خاص بات نہ تھی، وہ ایک عام سے آدمی تھے تصنع اور تکلف سے بے نیاز، تدبّر اور تکبّر سے کوسوں دور مسکراہٹ میں ایک بے ساختگی تھی اور قہقہوں میں ایک دل آویزی۔ پھر ۱۹۵۷ء کا دور آیا۔ بخشی غلام محمد اور ان کے ساتھیوں میں ٹھن گئی۔ غلام محمد صادق اور ان کے ساتھیوں نے وزارت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ بخشی صاحب کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ ان کی ذات مرکزِ کائنات ہے اور اگر دو ایک ستارے ٹوٹ کر گر بھی جائیں تو فضا میں چند مصنوعی سیارے چھوڑ کر نظامِ کائنات کو چلایا جاسکتا ہے اور حق یہ ہے کہ مصنوعی سیاروں کی مدد سے

بخشی صاحب نے کافی وقت تک کے لیے گردشِ کائنات کو قائم رکھا۔ شمہ صاحب کو بھی ۱۹۵۷ء کے خلا کو پر کرنے کے لیے بخشی صاحب نے فضائیں چھوڑ دیا وہ ۵۷ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک برابر گردش کرتے رہے، جب تک خود ان کا ستارہ گردش میں آ گیا۔

جب ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ زندگی کی ٹھوکریں کھانے کے بعد زندگی کی کسی خوشگوار منزل پر پہنچ جاتا ہے تو فطرت مسکرانے لگتی ہے۔ اپنے گود میں پالے ہوئے بچے کو جب وہ اٹھکھیلیاں کرتے دیکھتی ہے تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ شمہ صاحب کے وزیر بننے پر فطرت بھی مسکرائی تھی۔ خود شمہ صاحب بھی مسکرائے تھے۔ دونوں حیران تھے کہ یہ کیا ہو گیا!

اب شمہ صاحب عام آدمی سے خاص آدمی ہو گئے۔ وزیر بننے کے بعد ہر آدمی صاحب ہو جاتا ہے۔ اس لیے شمہ صاحب بھی شمس الدین سے شمہ صاحب ہو گئے۔ ان کی معصوم سی شخصیت پر تکلف اور تصنع کے پردے پڑ گئے۔ ان کے چہرے پر تدبّر اور تکبّر کی سُرخی چھا گئی۔ ان کی مسکراہٹیں مصنوعی اور ان کے قہقہے کھوکھلے ہو کر رہ گئے۔ انسان سے وزیر بننے کے لیے کچھ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ شمہ صاحب نے اپنی غربت کا خیال کر کے یہ قیمت بھی قسطوں میں ادا کر دی، اور جب وہ پوری قیمت ادا کر چکے تو وزیر سے وزیرِ اعظم ہو گئے۔ بحیثیت وزیر کے شمہ صاحب کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرنا ممکن نہ ہوگا، بخشی صاحب کے دورِ حکومت میں وزیر، وزیر سے زیادہ ربڑ کی مہریں ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ وزراء جو بخشی صاحب کے چھینکنے سے جنم لیتے تھے۔ شمہ صاحب بھی بخشی صاحب کی چھینک ہی کی پیداوار تھے۔ لیکن ایک بات عیاں ہے کہ شمہ صاحب نے کچھ اپنی سادگی اور کچھ اپنی شرافت سے بخشی صاحب کا اعتماد حاصل کر لیا تھا، اور یہی اعتماد بعد میں ان کو لے ڈوبا۔

اگست ۱۹۶۳ء میں بخشی صاحب کے کامراج جانے کے بعد جانشینی کی زبردست جنگ چھڑ گئی۔ جانشینی کے تین امیدوار تھے، خود بخشی صاحب جو مصنوعی ہنگامے بپا کر کے اپنا استعفیٰ واپس لینا چاہتے تھے۔ بخشی عبدالرشید، جو جاہلِ اعظم ہونے کی حیثیت سے وزیرِاعظم بننے کے دعویدار تھے اور میر راجپوری، جو اپنے سوا ہر کسی کو جاہل اور بے وقوف سمجھتے تھے۔ راویوں کا کہنا ہے کہ جب بخشی صاحب دلی سے مایوس لوٹ آئے کہ استعفیٰ واپس نہیں لیا جا سکتا، تو ان کی آنکھوں کے سامنے شمیم صاحب کا بھولا سا چہرہ آگیا۔ رشید کی جہالت اور راجپوری کی ذہانت ــ دونوں سے انہیں خطرہ تھا۔ قرعہ فال شمیم صاحب کے نام نکلا۔ خود شمیم صاحب کے لئے بھی یہ سانحہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وزیرِاعظم منتخب ہونے پر زار زار رونے لگے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے یا آنے والے حادثات میں بہائے جانے والے آنسوؤں کی پہلی قسط کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

شمیم صاحب تین مہینے اور کچھ دن وزارتِ عظمیٰ سے وابستہ رہے۔ آئینہ ساز کی نگاہوں میں وہ دنیا کے معصوم ترین وزیرِاعظم تھے، انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا ہیں، کیوں ہیں، اور کیسے ہیں؟ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ انہیں کرنا کیا ہے۔ بخشی صاحب نے ان کے ساتھ بڑا مذاق کیا۔ بچارے شمیم صاحب کو بھی معلوم تھا کہ ان کے ساتھ مذاق ہوا ہے۔ لیکن وہ بے بس تھے۔ دنیا نے آج تک اتنا بے بس وزیرِاعظم نہ دیکھا ہوگا۔ اقتدار اب بھی بخشی صاحب کے پاس تھا۔ اختیار اب بھی بخشی رشید کے پاس تھا لیکن کرسی پر شمیم صاحب بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ وہ وزیرِاعظم ہیں۔ شمیم صاحب عجیب و غریب حرکتیں کر بیٹھتے۔ ایک مرتبہ انہیں بہت دور کی سوجھی ـــ انہوں نے ۷۰ سرکاری ملازموں کو ناکردہ گناہوں کی۔ یادداشت میں نوکری سے برطرف کر دیا۔ گناہگار

افسر زیرلب مسکراتے رہے، کہ "یہ اچھا ہوا"

پھر مودئے مقدس کا طوفان امنڈ آیا، جس میں سینکڑوں بچشیوں اور شمہ صابوں کی لاشیں تیرتی ہوئی نظر آئیں۔ شمہ صاب اپنے دیہاتی لب و لہجہ میں ریڈیائی لہروں پر بچاؤ بچاؤ کی آوازیں دیتے رہے۔ لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ شمہ صاب پر وزارت عظمیٰ کا تاج رکھنے والے نے یہ کہہ کر خود یہ تاج اُن سے چھین لیا کہ

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے

آج شمہ صاب پھر شمس الدین ہو گئے ہیں۔ تاریخ نے اپنا ایک چکر پورا کر لیا ہے۔ ٹھیک چھ سال تک شمس صاحب اپنی پیٹھ پر اپنے ماضی کا بوجھ لیے سرگرداں پھرتے رہے۔ انہوں نے کئی بار منسٹری کی پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ وہ وزیراعظم ہونے کے بعد محض وزیر نہیں ہو سکتے۔ انہیں کم از کم ڈپٹی چیف منسٹر ہونا چاہیے۔ لیکن سیاست کی بے رحم دنیا میں کون کس کا ماضی دیکھتا ہے۔ یہاں تو چلتا ہوا سکہ چاہیئے۔ اور پھر صادق صاحب کے بازار میں تو بہت سے چلتے ہوئے سکے بھی کھوٹے ہو گئے ہیں۔ زمانے کی سرد مہری، احباب کی بے التفاتی اور بدلتے ہوئے حالات کی غیر یقینیت نے بالآخر خواجہ شمس الدین کی سوئی ہوئی حقیقت پسندی کو جگا دیا۔ راجپوری صاحب کی "وفات" کے بعد جب انہیں اسپیکر بنانے کی پیشکش کی گئی تو انہوں نے آنکھیں بند کر کے 'ہاں' کہہ دی۔ آج کل وہ اسپیکر ہیں اور نہایت عمدگی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں!

(رسالنامہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء)

شیونرائن فوطیدار

شیونرائن کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا، لیکن ان کے متعلق کچھ کہنے کے لیے انہیں ذاتی طور پر جاننا بھی ضروری بھی نہیں۔ وہ ایک ایسی انجمن ہیں، کہ اس کا سائن بورڈ دیکھ کر ہی اس کے اغراض و مقاصد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً شیونرائن کے سراپا کو دیکھتے ہی آپ کو اندازہ ہو گا، کہ یہ شخص مختلف المقاصد ہو گا اور پھر جب آپ حیات شیونرائن کے ورق الٹیں گے تو آپ کو اپنے اندازے کی صحت پر حیرت ہو گی!

شیونرائن فرقہ پرست بھی ہیں اور قوم پرست بھی۔ وہ جاگیرداروں کے وفادار بھی ہیں اور کسانوں کے غم خوار بھی، وہ سوشلزم پر بھی یقین رکھتے ہیں اور یووک سبھا پر بھی! غرضیکہ ان کی شخصیت کی رنگارنگی میں ان کے فکری تنوع اور ان کی حقیقت پسندی، جسے کچھ کم ظرف موقع پرستی کہیں گے کی بہار ہے۔

شیونرائن کی سیاسی زندگی کا آغاز غالباً ان کی پیدائش سے کچھ ہی روز سے ہوتا ہے وہ ایک ایسے سماج میں پیدا ہوئے جہاں پیدا ہونے کے ساتھ ہی انسان کے مذہبی اور سیاسی نظریئے معین و مقرر کیے جاتے ہیں۔ شیونرائن زندگی بھر انہی نظریات کو سینے سے لگاتے رہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ اُن کے نظریات کو زمانے کی دستبرد سے بچانے کے لئے انھیں کبھی کبھی بہروپ بھی بھرنا پڑا۔ انہیں کبھی قوم پرست

بنا پڑا اور کبھی سوشلسٹ، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ بنیادی طور پر اپنے موقف کے وفادار رہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ کشمیری پنڈت جاتی کے رہنما ہیں اور باوجود اس کے کہ جاتی نے ان کے اس دعویٰ کو کئی بار چیلنج کیا ہے۔ وہ بڑی مستقل مزاجی سے اپنی رہنمائی کا جھنڈا بلند کئے ہوئے ہیں۔ شیو نرائن ان بلندیوں کو چھو گئے ہیں، جہاں رہنما عوام سے اتنے بلند ہو جاتے ہیں، کہ انہیں عوام کی ضرورت ہی نہیں رہتی، پچھلے سترہ برسوں میں اپنے ہاں سیاسی رہنماؤں کی ایک نئی قسم وجود میں آئی ہے ان رہنماؤں کے ہاں عوام میں مقبولیت یا عوام سے کسی قسم کے رابطے کو غیر صحت مند اور غیر مستحسن قرار دیا جاتا ہے۔ شیو نرائن بھی اس نئی لیڈر شپ کے چہیتے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے قبل شیو نرائن یووک سبھا کے رہنما تھے اور وہ ۱۹۵۰ء تک یووک سبھا سے بدستور وابستہ رہے۔ پھر ایک دن یہ اطلاع موصول ہوئی کہ وہ نیشنل کانفرنسی امیدوار شیام لعل صراف کے مقابلے میں الیکشن لڑ رہے ہیں۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا، وہ الیکشن کے میدان سے ہٹ گئے، اور کچھ ہی دنوں بعد پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے۔

۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد شیو نرائن نے قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ پھر ایک مضحکہ خیز بات ہو گئی۔ یووک سبھا اور نیشنل کانفرنس کی شادی ہو گئی۔ اہلِ نظر فلمی انداز میں چیختے رہے کہ "یہ شادی نہیں ہو سکتی" لیکن ان کی کون سنتا۔ یہ ناجائز شادی شیو نرائن کی حقیقت پسندی کا اعجاز تھا!

شیو نرائن پچھلے کئی سالوں سے لیجسلیٹو کونسل کے چیئرمین ہیں۔ شیو نرائن کا خیال ہے کہ "چیئرمینی" ان کی وفاداریوں کا معقول صلہ نہیں ہے۔ ان کے خلوص کی قیمت صرف منسٹری سے ہی ادا ہو سکتی ہے۔ بہر کیف، اس معاملے میں (صرف اس معاملے میں)، بخشی صاحب کا ان سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ اگست ۱۹۶۳ء میں جب

بخشی صاحب کا مراجے گئے تو شیو نرائن نے احتجاجاً اپنی کئی قمیضیں پھاڑ ڈالیں۔ یہ اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کی آخری کوشش تھی۔ ایک دلگداز تقریر میں انھوں نے کہا کہ "جب بخشی صاحب ہی نے ناطہ توڑا ۔ تو پھر ناطہ کیسا؟ بخشی صاحب نے نہ لوٹنا تھا نہ لوٹے۔ اور شیو نرائن کے منسٹر بننے کی آرزو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو گئی!

بہت دنوں سے شیو نرائن کے متعلق کوئی اطلاع نہیں آرہی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بن باس سدھار گئے۔ ان کے کچھ دوستوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ اپنی داستانِ حیات قلمبند کر رہے ہیں۔ بعض دشمنوں نے یہ افواہ اڑائی ہے کہ وہ محاذ رائے شماری کی یوو ک سبھائی شاخ کے صدر ہو گئے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ وہ فراٹے بھرتی ہوئی پلے موتھ کار جو شیو نرائن کی شخصیت سے زیادہ دل آویز اور خوبصورت تھی، اب بہت کم نظر آتی ہے۔ لیجسلیٹو کونسل کا چیرمین جو اپنے آپ کو نائب صدر ریاست کہہ کر اپنی محرومیوں کی تلافی کرنا چاہتا تھا، اب نہ معلوم کہاں چھپ گیا ہے۔ اسے دیکھنے کو نظریں ترس گئی ہیں۔

شیو نرائن کی شخصیت بڑی دلچسپ اور پہلو دار ہے۔ وہ صحیح انگریزی میں غلط قسم کی باتیں کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ بظاہر بہت معقول اور شائستہ ہیں۔ وہ ایک اچھے مقرر اور پارلیمنٹرین ہیں۔ کونسل کے چیرمین کی حیثیت سے انھوں نے اپنے فرائض کو بطریقِ احسن نبھایا ہے۔ وہ بڑے رنگین طبع اور خوش مذاق ہیں۔ پہناوے اور پینے کے معاملے میں وہ بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے دم سے ہمارے ہاں کی سیاسی زندگی کی رنگارنگی اور دلچسپیاں قائم ہیں۔ ہماری زندگی میں فرقہ پرستی اور قوم پرستی کا جو امتزاج ہے۔ شیو نرائن کی شخصیت اس کا ایک زندہ جاوید مظہر ہے۔

شیو نرائن کو جب ۱۹۶۷ء میں کانگریس کا ٹکٹ دے کر حبہ کدل کے حلقۂ انتخاب سے بطور امیدوار کھڑا ہونے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے بقائمی ہوش و حواس اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ ان کی دوربین اور حقیقت پسند نگاہوں نے تاڑ لیا کہ اس دعوت کا مقصد انہیں اپنے موجودہ منصب سے محروم کر کے سیاسی گداگری پر مجبور کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ منسٹر بننے کے لیے بے چین اور بے قرار ہیں لیکن اتنے بے قرار بھی نہیں کہ اس کی ہوس میں ہاتھ آئی ہوئی دولت کو بھی کھو بیٹھیں!

۱۹۶۷ء میں کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن کے دوران شیو نرائن کی قیادت کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا۔ ان کی مصلحت پسندی، عافیت کوشی اور دوراندیشی نے کشمیری پنڈتوں کو ان سے سخت بدظن کر دیا ہے۔ لیکن شیو نرائن نے ایک نہیں کئی انقلابات دیکھے ہیں۔ اس لیے "اشتعال انگیزی" کے باوجود انہوں نے اپنا توازن نہیں کھویا۔ وہ صادق صاحب کے نام زبردست احتجاجی خطوط لکھ لکھ کر اپنی بیزاری کا اظہار کرتے رہے، لیکن انہوں نے غصے میں آ کر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کہ جس کے لیے انہیں بعد میں ندامت ہوتی۔

شیو نرائن رندِ بلانوش ہیں۔ لیکن وہ صرف پیتے ہی نہیں بلکہ پلاتے بھی ہیں بے حد مہمان نواز زندہ دل آدمی ہیں۔ وہ اپنی بہت سی کمزوریوں کے باوجود بہت اچھے رفیق اور ساتھی ہیں۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

بہن جی

> بہن جی کا المیہ یہ ہے کہ اب شیخ صاحب اور بیگ صاحب بھی اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ بیگ صاحب اور محاذ رائے شماری کے سیکرٹری خواجہ غلام محمد شاہ نے تو اُن کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں وہ محاذ کے باغی سپاہیوں کی عملی اعانت کر رہی ہیں اور اس لیے گردن زدنی ہیں۔ اس طرح بہن جی کی ساری ریاضت، ان کی قربانیوں اور ایثار کا صلہ انہیں یہ مل گیا ہے کہ وہ بھی انہیں اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں۔ کہ جن کی خاطر انہوں نے ساری دنیا سے دشمنی لے رکھی ہے۔

مِس مردولا سارا بائی کی زندگی ایک نفسیاتی المیہ ہے۔ وہ شخصیات کو مقاصد کی علامت سمجھ کر مقاصد سے زیادہ علامتوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں اور پھر ان کے لیے شخصیت ہی مقصد اور علامت ہی منزل بن جاتی ہے۔ شیخ صاحب اُن کے لیے قوم پرستی، روشن دماغی اور خلوصِ نیت کا پیکر تھے۔ ان کی ذات میں مردولا جی کو باپو کا تقدس، جواہر کی عظمت اور اپنا خلوص نظر آیا۔ رفتہ

رفتہ رفتہ شیخ صاحب کی شخصیت ان تمام خصوصیات کی علامت بن گئی اور مردولا جی بدلتی ہوئی حقیقتوں کی تاب نہ لا کر اس دیوزاد شخصیت کے سائے میں پناہ گزیں ہوگئیں۔ حقیقتیں بدل گئیں۔ مقاصد بدل گئے، افراد کے باہمی تعلقات، سیاسی رشتے اور منزلیں بدل گئیں لیکن مردولا جی علامت کی پرستش کرتی رہیں۔ علامت ان کے لیے اس مقصد سے بھی عظیم تر ہوگئی ہے۔ جس کی نسبت سے انہیں علامت سے اُنس ہوگیا تھا!

پچھلے بارہ برسوں میں مس مردولا نے شیخ صاحب کے تئیں اپنی عقیدت اور والہانہ محبت کی جو قیمت ادا کی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ مردولا جی خود بھی کسی سیاسی فلسفے پر یقین رکھتی ہیں یا نہیں۔ جواہر لال نہرو نے ان پر اپنے دروازے بند کردیے۔ وہ ملک بھر کی نفرت اور غیظ و غضب کا مرکز بن گئیں۔ انہیں کئی بار ریاست بدر کردیا گیا۔ اور اُن کے دوبارہ داخلے پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔ نئی دہلی میں آج بھی ان کا مکان مرکزی سی۔ آئی۔ ڈی کی نگرانی میں ہے۔ ایک مرتبہ انھیں کچھ مدت کے لیے نظربند بھی کیا گیا۔ لیکن مردولا جی کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کشمیر کے متعلق شیخ صاحب کے موقف کی تبلیغ و تشہیر میں صرف کرتی رہیں۔ ان کی نظر میں شیخ صاحب کے اولین موقف میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اور جو لوگ شیخ صاحب پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بدل گئے ہیں۔ وہ دراصل خود بدل گئے ہیں۔ جب کبھی شیخ صاحب اپنے بیانات یا تقریروں کی روشنی میں مردولا جی کو غلط ثابت کرتے ہیں تو مردولا جی ان تقریروں اور بیانات کو فرضی اور جعلی قرار دیتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کا سارا پریس اور یہاں کی تمام خبر رساں ایجنسیاں شیخ صاحب کو بدنام کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ جب کبھی شیخ صاحب نے کوئی ایسی تقریر کی جو اپنے مواد کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے مردولا جی کی اس شبیہہ سے مطابقت نہ رکھتی ہو، جو ان کے ذہن میں ہے تو وہ شیخ صاحب سے تصدیق کیے بغیر، اخباری اطلاعات

کو غلط اور بے بنیاد قرار دیتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پچھلے سرما میں جب شیخ صاحب نے حضرت بل میں ترکِ موالات کے سلسلہ میں ایک زبردست تقریر کی اور اس کی رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی تو مردولا جی علی الصبح ہندوستانی رہنماؤں کے پاس شیخ صاحب کی صفائی پیش کرنے کے لیے گئیں۔ کہ دراصل شیخ صاحب کا مقصد وہ نہیں جو اخباری اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ خود شیخ صاحب نے بعد میں مردولا جی کو غلط ثابت کر دیا۔ مردولا جی کبھی یہ مان ہی نہیں سکتیں کہ شیخ صاحب سے ارادی یا غیر ارادی طور پر غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی حالت ایک ایسی ماں کی ہے جو اپنے بچے کی غلطیوں کے حسین حسین جواز تراش کر دُنیا کو یہ باور دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ اس کا بچہ معصوم ہے۔ مردولا جی کو شیخ صاحب سے جو عقیدت ہے اس میں ماں کا پیار، بہن کی شفقت اور ایک دوست کی محبت شامل ہے، جو ہر حال میں ہر قیمت پر عہد وفا نبھانا چاہتا ہے۔ مردولا جی کے بارے میں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ انہیں شیخ صاحب کی سیاست، ان کے سیاسی نظریات کشمیر یا کشمیری عوام سے کوئی دلچسپی ہے۔ انہیں اس ذات سے وابستگی ہے جس کا نام شیخ محمد عبداللہ ہے اور اس مرحلہ پر پہنچ کر ان کی اپنی شخصیت ایک نفسیاتی معمہ بن جاتی ہے۔ ان کی زندگی اس بے نام سے مقصد کا حصول بن کر رہ گئی ہے۔ جس کی علامت شیخ صاحب ہیں۔ اور اس کے لیے ان کی ہمت، ان کے استقلال اور قوتِ برداشت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ شیخ صاحب سے ان کی عقیدت کا فیض شیخ صاحب کے وہ بہت سے ساتھی بھی اُٹھا رہے ہیں۔ جنہیں دہلی میں سر چھپانے کو کہیں جگہ نہیں ملتی۔ ڈپلومیٹک انکلیو میں ان کی خوبصورت کوٹھی اُن تمام کشمیریوں کے لیے مسافر خانے کی حیثیت رکھتی ہے، جو شیخ صاحب سے وابستگی کے جرم میں دہلی کا سفر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

مردولا جی ہر بحران کے وقت کشمیر میں نازل ہو جاتی ہیں۔ شیخ صاحب کی رہائی ہو یا ان کی گرفتاری، ترکِ موالات کی تحریک ہو یا پاکستانی حملہ ــــ آپ مردولا جی کو اپنی عقیدت اور اپنی حسرتوں کا بوجھ لیے ہوئے شہر کی سڑکوں پر متحرک دیکھیں گے۔ اس عورت میں بے پناہ ایثار اور قربانی کا جذبہ ہے۔ صحیح یا غلط، وہ جب اپنے لیے کوئی منزل طے کر لیتی ہے تو اپنی ساری زندگی اس منزل تک پہنچنے پر صرف کرتی ہے۔ ایسی عورتیں تو کیا، ایسے مرد بھی ہماری دنیا میں نایاب ہیں۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی ہندوستان کی یہ متمول خاتون اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک ہاری ہوئی جنگ کو اس یقین اور اعتماد کے ساتھ لڑ رہی ہیں کہ جیسے لڑنا ہی اُس کا اصل مقصد ہو۔ پچھلے ہفتے مردولا جی کو ایک بار اور ریاست سے باہر کا حکم دیا گیا۔ ان پر یہ الزام ہے کہ وہ بیرونی اخبارات کے نمائندوں کو غلط قسم کی اطلاعات دے کر ہندوستان کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں ریڈیو پاکستان سے ان کا ایک بیان بھی نشر کیا گیا۔ مردولا جی کا کہنا ہے کہ یہ غلط ہے اور انہوں نے کسی غیر ملکی نمائندے کو کوئی بیان نہیں دیا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ بات بجائے خود بڑی دلچسپ ہے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

746

دینا ناتھ نادمؔ

مشہور برطانوی مصنف جے بی پریسٹلے نے حال ہی میں پچھترویں سالگرہ پہ کہا کہ اب ہمارے گردو پیش عظمت اور آن بان رکھنے والی شخصیات خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ کشمیری ادب کے مختصر سے نگارخانے پر نظر دوڑاتے ہوئے اس حقیقت کا بڑی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہی بات کیا کم ہے کہ ایک ایسی شخصیت فوراً جبین نیاز کو خم کرنے پر مجبور ہوتی ہے، جو ہر پیمانے اور ہر لحاظ سے آن بان کے حامل اور عظمت کے ہم سایہ ہے ـــ دینا ناتھ نادمؔ معاصر کشمیری کا ہی سب سے بڑا شاعر ہی نہیں بلکہ کشمیری زبان کی تاریخ کے سب سے قدآور ادیبوں میں بڑی شان اور رتبے کا شاعر ہے۔

نادمؔ شاید سارے کشمیری شاعروں میں واحد شخصیت ہے، جس کی جسمانی شباہت عام پیمانوں سے بڑھ کر ہے اور جس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ ہم کسی بڑے اہرام کے سامنے گزر رہے ہیں۔ لمبے قد اور چکلے ہاڑ کا نادمؔ جو گردن تک بال رکھتا ہے، اپنی ظاہری شکل وصورت میں بڑا مرعوب کن ہے کبھی وہ چین کے ماؤزے تنگ کے فیشن کا کوٹ پہنتا تھا۔ کیونکہ وہ چین جانے کے بعد اس کا بڑا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اس کے شاعرانہ ذہن کو ماؤ کی رومانی شخصیت نے متاثر کیا تھا۔ لیکن اب چین ہمارا دشمن ہے اور شاعر کی سی غیر مستقل مزاجی کے ساتھ نادمؔ

نے اس کوٹ کو بھی اتار پھینکا ہے۔ اس کوٹ کو ترک کرنے کی کہانی بڑی عجیب ہے کیونکہ اس کے ساتھ نادم کی ذہنی دنیا کے کچھ پُراسرار جوار بھاٹے بھی وابستہ ہیں کبھی وہ اشتراکی تھا لیکن ایک عاشق کے جذبات والہانہ اور سرمستیٔ مجنونانہ کے ساتھ، وہ آج بھی اشتراکی ہے۔ لیکن ایک مصلحت اندیش کی ہوشیاری اور زمانہ سازی کے ساتھ پہلے یہ منظر اُس کا معشوق تھا۔ اب یہ اُس کے حرم سرا کا پہرے دار ہے اور وہ خُمار اتر جانے کے بعد اب ایک جابرانہ تقدیر کے ساتھ سمجھوتے کی کوشش کر رہا ہے۔ نادم کی ابتدائی زندگی کے متعلق آیئنہ ساز کی معلومات بہت کم ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی جوانی بڑی رنگین گذری ہے۔ غالب نے اسے فسق و فجور کا زمانہ کہا تھا، لیکن نادم اب بھی اس زمانے کو یاد کر کے نادم نہیں ہوتا۔ بعد میں ہندو ہائی اسکول اُس کا محبوب بن گیا اور اُس نے اُس کے ساتھ نکاح پڑھ لیا۔ اس کی یہ رفیقۂ حیات اس کی بڑی وفادار ثابت ہوئی ہے۔ کبھی کبھی اشتراکیت یا سرکاری ملازمت کی عشوہ طراز طوائفیں اس کو اپنی زلفوں کا اسیر کرتی ہیں۔ وہ ایک ہوس کا مرد کی طرح ہندو ہائی سکول کو بھلا دیتا ہے، لیکن جونہی یہ معشوقانِ ہرجائی اُسے چھوڑ دیتی ہیں۔ ہندو ہائی سکول اپنی محبت بھری باہیں واکر کے اس ازخود رفتہ آدمی کو پھر اپنی گرم آغوش میں لے لیتا ہے۔

نادم کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اُس کی آنتوں کی بیماری اور غلاظت کے ساتھ اس کے اٹوٹ ناطے پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ آنتوں کی نامراد بیماری کا مستقل مریض ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے مدّت سے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ گندگی اور غلاظت میں اُسے بے حد سکون ملتا ہے۔ جس دن اُس کی قمیض میلی نہیں ہوتی، وہ کچھ پریشان سا اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا نظر آتا ہے۔ حجامت شاید وہ ہفتوں کے بعد بنا تا ہے۔ وہ کبھی نہاتا ہے یا نہیں، اُس کے متعلق کچھ

کہنا مشکل ہے، لیکن یہ کہنا مشکل نہیں کہ نہانا اُس کے لیے کسی بڑی سے بڑی سزا کے برابر عذاب ہے۔ دینا ناتھ نادم کو کچھ دن پہلے سرکاری ملازمت سے برخواست کر دیا گیا۔ وہ اس سے قبل دو ڈھائی سال ملازم رہے اور وہی صورت پیش آئی جو جنگل کے بادشاہ کو تانگے میں جوت دینے سے پیش آتی ہے۔ اُس محکمے کی لٹیا ہی ڈوب گئی، لیکن نادم کی لاپرواہیوں اور بے نیازی کے طفیل اُس محکمے کے کچھ شاطروں نے اپنی عاقبت ضرور سنوار لی۔ طرہ یہ کہ انہوں نے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد اس درویش کی پیٹھ پر چوری کا صندوق سمو دینا چاہا۔ نہ جانے نادم اس دھندلکے سے کس طرح سُرخ رو نکل آنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ایک ثابت ہو گئی کہ اُس کی پیٹھ پر بندوق رکھ کر شکار کرنا کتنا آسان ہے۔

شاعر کی حیثیت سے نادم کا تجزیہ کرنا، قلمی چہرے کے چوکھٹے میں پوری طرح نہیں سما پائے گا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنی گرجدار، اتنی پر جلال اور پر شکوہ، اتنی تازہ اور مہکتی ہوئی، اس قدر طبع زاد اور خالص کشمیری آواز ہم نے مدت سے نہیں سنی۔ وہ ہمارے ادب کا دیو زاد ہے۔ اسے انعامات نہیں ملے، کیونکہ وہ انعامات سے بڑھ کر عظیم ہے۔ اس کی آواز میں کسی دلکش الہام کی سی نزدیکی اور ساتھ ہی ساتھ DETACHMENT ہے، لیکن اس نے اپنے کلام کی شیرازہ بندی نہیں کی، یہ کام اس کی شان سے فروتر ہے یہ ایسا ہی ہوا کہ کوئی چرچل وکٹوریہ کراس کے لیے درخواست پیش کرے۔ شاید اس کا بہت سا کلام زمانے کے ہاتھوں ضائع ہو جائے گا لیکن عظمت کی جو مہر اس کی تحریر پر ہے وہ اس کی بچی ہوئی چند ہی نظموں کو کشمیری زبان کی Legend کا رنگین، دلاویز، پُر فسون اور شاندار باب بنا کے دم لے گی۔ نادم کی شاعری کی عظمت ایک طرف، اُس کی ذاتی خوبیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اُس کی علمی سطح بڑی اونچی ہے اور وہ کسی بھی مضمون پر جو طب سے لے کر طبعیات

تک پھیلا ہوا ہو، تازہ ترین معلومات کے انبار لگا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تیز نظر حقائق کے وجود میں تیر کی طرح چبھ جاتی ہے اور اُن کے جوہر کو عریاں دیکھ لیتی ہے۔

نادمؔ نے زندگی میں بہت سے سمجھوتے کیے ہیں اور اس لیے وہ ایک بڑے سمجھوتے باز کی حیثیت سے مشہور ہے۔ بخشی غلام محمد نے لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب میں اسے مات دینے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، لیکن جب نادمؔ جیت گیا تو بخشی صاحب بھی اس کی رسیلی باتوں کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ نادمؔ نے بخشی صاحب پر طنز کرتے ہوئے کہا ع

خواجہ محمد چھ نواب
موہ رُود تو تہ موہ مے
اکھ پر یژھ ونتہ جواب
چاؤ مے جام بیمے

بخشی صاحب خفا ہو گئے تو دوسرے دن نادمؔ ان کے دیوان خانے پر پہونچا اور وہاں اپنی فصاحت سے بخشی کا دل کچھ اس طرح لبھا لیا کہ وہ اس "بے ایمان" پر ایمان ہار بیٹھے

صادق صاحب کا ہمدم اور ہمراز ہونے کے باوجود نادمؔ ان کے مشیروں میں شامل نہیں اور نہ صادق صاحب کو ان کی رفاقت میں سکون میسر ہوتا ہے۔ نادمؔ کی اپنی توجیہہ یہ ہے کہ میرے اشعار کی تیز دھار کا رُخ چاہے کسی سمت بھی کیوں نہ ہو، مسند اقتدار پر بیٹھے ہوئے حاکم کو اس کی اذیت سے بچایا نہیں جا سکتا۔

نادمؔ کو آج کل دیکھیے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالبؔ کے اِس مصرعے کی تفسیر ہے ع

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا ....

اُس نے ایمان اور ایقان کی راہ اختیار کی تھی، لیکن وہ بے یقینی اور یاس کے دھندلکوں میں پہنچ گیا ہے۔ اس نے زندگی کے جلال کو سینے سے لگایا تھا، لیکن آج وہ اس کے جمال سے بھی خائف ہے۔ صرف اُس کا فن اُس کے ساتھ ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ جس دن مجھے تازہ غم سے سابقہ نہیں پڑتا مجھے ایک عجیب قسم کی پیاس محسوس ہوتی ہے۔ اچھا ہے کہ اس کی یہ پیاس ابھی تک نہیں بجھ پائی اور اس لیے اس کے فن کی آرسی روز بروز زیادہ روشن اور زیادہ ضوبار ہوتی جارہی ہے۔ نادم کی پچھلے زمانے کی نظمیں اب باسی لگتی ہیں، لیکن اس کی نئی نظموں میں جو خوشبو ہے، وہ کسی مصنوعی عطر کی نہیں بلکہ اُن کے باطن سے ابلتی معلوم ہوتی ہے کسی غزل کے نافے کی طرح۔

نادم کا پیکر خاکی ہے اور فنا ہوگا، لیکن اس کا جوہر اس کا آرٹ ہے، جو زمانے کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

حاجنی صاحب

اقبالؒ نے میلاد آدم کے وقت اس عظیم واقعے کا فطرت کے دوسرے عناصر پر ردِعمل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شُد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد

حُسن حضرت آدم کو دیکھ کر لرزا اٹھا ہو یا نہ ہو لیکن کشمیری ادب اُس دن ضرور لرز اُٹھا ہوگا۔ جس دن پہلے پہل اس آشفتہ خو مجنون نے اُس کی پریشان زلفوں کی مشاطگی کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ علم وفنون کی دیوی سرسوتی کے حضور ستار یا اکتارہ لے کر حاضری دینا موجب سعادت ہے، لیکن حاجی صاحب ہل لے کر آئے اور اپنے دہقانی کس بل کے ساتھ اس بنجر زمین کو جوتنے میں مصروف ہو گئے۔ واقعی ادب کی دیوی نے اس چال ڈھال کے عاشق کم ہی دیکھے ہوں گے۔ زبان پر دہقانی لہجے کی مغلظ گالیاں ہاتھ میں رستم کے گُرز کی طرح وزنی آلاتِ کشاورزی ــــ مگر دل میں خلوص اور وفا کی قندیل ــــ لگن اور ذہانت کا شعلہ۔

شاید حاجنی اور ایس، پی کالج کا رشتہ پچھلے جنم ہی سے طے ہو گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایس۔پی کالج میں کب آئے اور کیسے آئے۔ امتدادِ زمانہ سے اب

وہ ایس۔پی کالج کی عمارت کا ایک حصّہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی چمنی کی طرح اس کے ہال میں لگی ہوئی کسی بینچ کی طرح اُن کو دیکھ کر یہ سوال ہی ذہن میں نہیں آتا کہ وہ ایس۔پی کالج میں کب آئے اور کیسے آئے۔ زمانے نے کتنی قلابازیاں کھائیں لیکن "زمین جُنبد نہ جُنبد گل محمد"۔ حاجنی صاحب اس فانی دنیا میں روشنی کا مینار بن کر ایس۔پی کالج میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ روایت ہے وہ حاجن کے رہنے والے ہیں اور اس کی تصدیق اُس روز ہوتی ہے جب سوناواری میں ہر سال سیلاب آتا ہے اور حاجنی صاحب اوڈین ہوٹل میں چاپ چاپ کی بلند آہنگ آواز کے ساتھ کباب کی کئی پلیٹیں صاف کرتے ہیں اور اپنی جائیداد کی تباہی کا رونا روتے ہیں محی الدین صاحب کے حاجنی ہونے کا اس سے بڑا ایک اور ACID TEST بھی ہے۔ یعنی آپ نے کسی چیتھڑے میں وہاب حاجنی (حاجنی صاحب معاف نہ فرمائیں گے اگر ان کے ساتھ فردوسی کشمیر کا لقب بھی نہ لکھا جائے) کے متعلق تین چار جملے چھپوائے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ کے دادا، پردادا کو گالیوں کے وہ تحفے ملیں گے، کہ خود آپ کی طبیعت پھڑک اُٹھے گی۔ یہ جرم ایسا ہے کہ حاجنی صاحب اس کو معاف نہیں کر سکتے۔ مسدس حالیؔ کا حاجنی صاحب نے جو ترجمہ کیا ہے اس کے خلاف کچھ کہنے سے بھی آپ کی خیر نہیں، لیکن جرائم خفیہ کی ذیل میں آئے گا۔ کہ وہابؔ کے خلاف ـــ ایک دم ـــ گناہِ کبیرہ یعنی ڈیفنس آف انڈیا رولز۔

حاجنی صاحب سے کچھ سمے بات کرنے کے بعد وہ فقرہ یاد آتا ہے جو کسی تذکرہ نویس نے میر تقی میرؔ پر چسپت کیا تھا ـــ "بلندش نہایت، بلند و پستش غایت پست" ایک ہی سانس میں ادب و فن کے بصیرت افروز رموز، سائنس اور فلسفے کے دقیق نکات، سیاست و فقہ کے بلیغ رمز اپنے کھُردرے دہقانی لہجے میں سُلجھاتے جائیں گے، لیکن دوسرے ہی لمحے "ہیڈ لانگ" کر کے دُنیا بھر کے مغلظات اور انتہائی

چھوٹی باتیں دہرانا شروع کر دیں گے اور آپ "یا الٰہی ماجرا کیا ہے"، کہتے ہوئے ان کا منہ تکتے رہیں گے۔" لیکن حاجنی صاحب کی گالیوں سے ان کے جاننے پہچاننے والے خائف نہیں ہیں۔ اس فنِ کثیف میں ان کا ہمسر اگر کشمیر میں کوئی ہے تو وہ میر راجپوری ہیں۔ دونوں حضرات گالیاں ایجاد کرنے میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے مستحق ہیں۔ دونوں حضرات گالیاں دیتے ہوئے شرم اور نفاست نام کی کسی چیز سے پریشان نہیں ہوتے بلکہ گالی ایسے دیتے ہیں جیسے دعائیں دے رہے ہیں۔ مگر مماثلت یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ راجپوری کی گالیاں اُس کی بیمار روح کی ڈراؤنی چیخیں اور اُس کے جذبۂ انتقام کی نوکدار سلاخیں ہیں۔ حاجنی کی گالیاں بے ریا دل کی بے سنگم موجیں اور اس کے پیار اور خلوص کا بھونڈا اظہار ہیں۔ اور اسی لیے جہاں راجپوری کی گالی سے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے، وہاں حاجنی صاحب کی گالی کے بعد غالبؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اور اس میں شک نہیں کہ حاجنی کا دل چشمۂ زلال کی طرح صاف، شیریں اور شفا بخش ہے۔ حاجنی بحث کرتے وقت اپنے آپ کو بڑا پکا مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے سو فیصدی عربی جو وحدتِ اسلام اور اس کے توحیدی فلسفے کا علمبردار ہو، لیکن ذرا سا کریدئے تو معلوم ہوگا کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ وہ کشمیری زبان کا عاشق زار ہے۔ اسلام اور کشمیری زبان میں ترجیح کے وقت اُسے آخر الذکر کی طرف جھکنے میں کوئی عار نہیں ہوگا۔ وہ تنگ نظر اور کوتاہ اندیش تو نہیں لیکن انہیں ترقی پسند یا وسیع النظر کہنا بھی مشکل ہے۔ وہ ہوائی جہاز کی اہمیت اور افادیت سے واقف ہیں، لیکن بیل گاڑی سے انہیں عشق ہے اور اسی لیے وہ بیل گاڑی اور ہوائی جہاز

کے درمیان لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ذہنی ارتقار کا عمل ایک جگہ آکر رُک گیا ہے۔ اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اب اس کے آگے کچھ بھی نہیں ہے وہ عربی کے پروفیسر، اردو کے شیدائی اور کشمیری کے ادیب ہیں اور انہیں افسوس اس بات کا ہے، کہ ان تینوں زبانوں کا انجام روز بروز غیر یقینی ہوتا جا رہا ہے۔

حاجنی صاحب ہمارے پروفیسروں کی بالشتہ قد نسل میں دیوزاد نظر آتے ہیں۔ وہ نکٹائی اور کتابی چہرے کی سند لے کر کلاس میں نہیں جاتے بلکہ نقدِ علم وحکمت لے کر۔ وہ عربی کے پروفیسر ہیں۔ لیکن سائنس، آرٹ اور نفسیات پر اُن کی نظر بڑی گہری ہے۔ وہ اپنی ظاہری شکل وشباہت سے بے پرواہ ہیں۔ مگر اس بے نیازی میں قلندری کی شانِ بے نیازی ہے۔ لیکن ساہتیہ اکادمی اوارڈ کی معشوقہ کے عشق بلاخیز نے ان سے توازن عقیدے اور ضبط کی تمام ادائیں چھین لی ہیں۔ عالمی ادب کے بحرِ بیکراں سے ہٹ کر وہ کشمیری ادب کے کوزے میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ انہیں سارا اسیکولرازم اس لیے فراڈ نظر آتا ہے کہ اُنہیں آج تک ایوارڈ نہ مل سکا ہے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

سنتوش

چھن کرال محلہ سری نگر کا رہنے والا غلام رسول ڈار نہ صرف سارے ملک میں سنتوش مصور کے نام سے جانا جاتا ہے بلکہ ملک کے باہر بھی اس کی تصویروں کو عزت اور توقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ سنتوش کسی زمانے میں سائن بورڈ لکھا کرتا تھا۔ گاڑیاں رنگا کرتا تھا اور گاڑیوں کے اندر اور باہر طرح طرح کی ہدایات اور بے جوڑ شعر لکھا کرتا تھا۔ جیسے سواری اپنے سامان کی خود ذمہ دار ہے۔ چلتی گاڑی سے سر اور ہاتھ باہر نہ نکالیں، سامان پیچھے سے اتاریں ــ خدا حافظ ــ چل چھکڑے تینوں رب دی آس وغیرہ وغیرہ ــ لیکن سنتوش کی تصویریں اب روم تل ابیب، پیرس، نیویارک، لندن، شکاگو اور دنیا کی کئی راجدھانیوں کے میوزیموں اور آرٹ گیلریوں میں فخر سے دکھائی جاتی ہیں۔ رنگ سازی سے مصوری تک کا سفر بڑا دلکش اور دل رُبا ہے اور اگر آپ اس سفر کی مختلف منزلوں اور مراحلوں کا ایک بھرپور جائزہ لینا چاہتے ہیں تو سنتوش کا ناول "سمندر پیاسا ہے" ضرور پڑھئے، مگر ٹھہریئے، گھبرایئے نہیں، ہم جانتے ہیں کہ آپ ناول تو کیا روزانہ اخبار بھی مفت پڑھنے کے عادی ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں، آپ سنتوش کو اس کے دلّی کے پتہ پر لکھیے اور اس میں یہ کہیئے کہ آپ کے ناول کی بڑی تعریف سنی ہے، کیا میں اسے پڑھ سکتا ہوں۔ اور یقین مانیئے کہ سنتوش دلّی سے ہی ناول، رجسٹرڈ پوسٹ سے آپ کے نام مفت بھیج دے گا

اور آپ سے ناول کے بارے میں رائے بھی نہیں مانگے گا۔

سنتوش جس قدر سیدھا سادا اور غیر متاثر کن نظر آتا ہے۔ وہ اسی قدر عظیم ہے اس کی عظمت صرف اس کے فن میں ہی نہیں، اس کی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ وہ اپنے سے کم تر اور کم رتبہ لوگوں میں ایسے گھل مل جاتا ہے، جیسے دودھ میں کھانڈ۔ وہ گھر گرہستی کے معاملات سے لے کر حسن و عشق کی داستان تک کسی بھی موضوع پر اپنا نظریہ یا رائے ٹھونسے بغیر ہی بڑے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنے دل کی بات زبان پر لا سکتا ہے۔ سنتوش کو ریاکاری چھو کر بھی نہیں گذری ہے۔ اور ریاکاری ایک ایسی چیز ہے، جو ہمارے بیشتر مصوّروں، ادیبوں اور شاعروں میں مشترک ہے۔ ہاں سنتوش میں ایک عیب ضرور ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے پرائے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کا عادی رہا ہے اور ہر سال کوئی نہ کوئی ایسا ہنگامہ کھڑا کر دیتا ہے کہ سب کو ایک شدید ذہنی جھٹکا لگتا ہے۔ سنتوش کا تازہ ترین ہنگامہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے ایک دوست کی بات پر چڑ کر اردو میں ایک ضخیم ناول لکھا ہے اور سنتوش کا وہ دوست اور کشمیر کے دوسرے اردو ادیب زلیخا کی باندیوں کی طرح سیبوں کے بدلے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ سنتوش کا یہ ناول عظیم نہ سہی لیکن اس کا موضوع اتنا عظیم ہے کہ ہم آپ اس کے تصوّر سے ہی ایک تھرل (Thrill) محسوس کرتے ہیں۔ سنتوش کے بارے میں تازہ ترین اطلاع یہ آئی ہے کہ وہ کشمیری شاعروں کی صفوں میں انتشار ڈالنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو کے کل ہند مشاعرہ میں اپنی شہرہ آفاق نظم "میری سہیلی نورا" پڑھنے کے لیے بک ہوا ہے۔ اور سنتوش نے یہ دعوت منظور کر لی ہے۔ ایک اور ہنگامہ جو سنتوش نے کیا ہے یہ ہے کہ اس نے کشمیری زبان کی پہلی فلم "مہندی رات" کے گیت لکھے ہیں۔ یہ گیت بڑے خوبصورت اور پیارے ہیں۔ اور اگر انہیں عام ہندوستانی فلمی گیتوں کی طرح ریڈیو سیلون یا ریڈیو کشمیر سے بجایا

جائے تو یہ فلمی زبان میں ہٹ گانے بن سکتے ہیں۔ ہمارے سراغ رسانوں نے یہ اطلاع دی ہے کہ سنتوش کے اس کارنامے سے کشمیری زبان کے ٹکسالی شاعر جل بھن کر کباب ہو رہے ہیں اور فلم "مہندی رات" کے فلم ساز کو گالیاں دے رہے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ان ہنگاموں میں سنتوش کا کوئی قصور نہیں، یہ تو اپنے آپ ہی رونما ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی پاداش میں سنتوش کو گالیاں دینا ایسا ہے، جیسا کوئی آسمان پر تھوکے۔

سنتوش رنگوں کا بادشاہ ہی نہیں ان کا شیدائی بھی ہے۔ اس نے اس وقت رنگوں کی دنیا میں قدم رکھا تھا جب آپ نے اور ہم نے "سترہ رنگوں کی جنت اور جہنم میں ٹنگری رکھی تھی۔ رنگوں سے اسے بے پناہ پیار ہے۔ سنتوش کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس نے زندگی میں جو چاہا وہ اسے مل گیا۔ اس نے مصوّر بننے کی خواہش کی تو ملک کے اچھے اور نامور مصوّروں کی صفِ اولین میں آگیا۔ اس نے کشمیری زبان میں شاعری کی تو اپنی پیاری نظمیں اور سانیٹ لکھ کر اس ارمان کو پورا کیا۔ اس نے اردو زبان پر قدرت حاصل کرنے کے لیے "سمندر پیاسا ہے" جیسا ضخیم اور پیارا ناول لکھا۔ لیکن یہ سب چیزیں حاصل کرنے کے لیے سنتوش نے کام کیا ہے۔ دن رات ایک کر کے محنت کی ہے۔ آپ تجریدی فن کو بھلے سے ہی بوگس اور مہمل قرار دیتے ہوں، لیکن جب آپ سنتوش کو کسی کینواس پر رنگ بکھیرتے دیکھیں گے تو آپ کو کوئی چیز یہ بات ماننے کیلئے مجبور کرے گی، کہ یہ فن کوئی ڈھکوسلا نہیں بلکہ ایک سچائی ہے۔ سنتوش کی تصویروں کو دیکھ کر آپ کا اٹھا ہوا قدم رک جائے گا۔ اس کے خاکوں، رنگوں اور لکیروں کے سنگم کو دیکھ کر آپ بہت کچھ سوچیں گے۔ آپ کا دل اور دماغ ایک ایسی فرحت اور مسرت سے لبریز ہوگا جو آپ کسی بھی دوسری حقیقی چیز کو پاکر غالباً کبھی بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ آپ سنتوش کی کسی بھی نمائش میں جائیے تو اس کی تصویروں کو دیکھ کر آپ کے دِل

میں ارمانوں کے ایسے موتی پھوٹ پڑیں گے جن کا آپ کو اس سے پہلے کبھی علم بھی نہ ہوگا۔ آپ کی آنکھوں کی پیاس کچھ اس حد تک نہ بجھے گی، کہ آپ ظاہری طور پر لاتعلقی کا اظہار کرنے کے باوجود سنتوش کے آرٹ کا لوہا مان لیں گے۔ سنتوش عظیم فن کار ہونے کے باوجود ایک انسان ہیں۔ انسانوں کی طرح اس میں بھی چھوٹی چھوٹی خامیاں ہیں جو اس کے حسن کو اور زیادہ مکمل بناتی ہیں۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

بنسی نردوش

آپ اگر کسی محفل میں جائیں اور وہاں ناٹے سے قد کا میلا، کچیلا، سوکھا مریل سا انسان گلا پھاڑ پھاڑ کے چلّا رہا ہو، تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بنسی نردوش ہے۔ اگر آپ شہر کے کسی قہوہ خانے میں کسی میز کے گرد چھ سات آدمیوں کو ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھا ہوا دیکھ لیں تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ اس میز کے کسی کونے میں نردوش بیٹھا ہوا کوئی قصّہ کہانی بیان کر رہا ہوگا۔ آپ اگر کسی ادبی محفل میں کسی انجان ادیب کے چہرے کو غیر معمولی آتار چڑھاؤ اور احساس کی پوری شدت کے ساتھ افسانہ پڑھتے ہوئے دیکھ لیں، تو وہ بنسی نردوش ہوگا۔ اگر کبھی ریڈیو اسٹیشن جانے کا اتفاق ہو اور کسی کمرے میں میز پر جھکا ہوا کوئی آدمی منہ بسور کر لکھنے میں مصروف نظر آئے، تو وہ بنسی نردوش ہوگا، کیونکہ جب وہ لکھنے بیٹھتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ شدید قبض کی شکایت رفع کرنے کے لیے اپنی ساری قوتِ ارادی سے کام لے رہا ہے۔

بنسی نردوش سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں شہر میں کلچرل فرنٹ کا بڑا دور دورہ تھا۔ نمائش گاہ میں فرنٹ کی ادبی نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ میں ایس، پی کالج میں نیا نیا ہی داخل ہوا تھا اور ہر اُس انسان سے بآسانی مرعوب ہو جاتا تھا، جس کا نام کسی اخبار یا رسالے میں چھپا دیکھتا تھا۔

نردوش کا ایک افسانہ "ریڈیو لیمپ اور انسان" میری نظر سے گذرا تھا۔ مجھے

اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ میں نے وہ افسانہ پڑھا تھا یا نہیں۔ اور اگر پڑھا تھا، تو میں اُس سے متاثر ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ نردوش کا نام میرے ذہن میں منقش ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں بنی ہوئی شبیہہ جب نردوش کے مادی وجود سے ٹکرائی تو پاش پاش ہو گئی۔ نردوش ایک پھٹی پرانی میلی سی بش شرٹ اور ملیشیا کی بڑے بڑے پائنچوں والی پتلون پہنے کسی جیل سے بھاگا ہوا قیدی نظر آرہا تھا۔ میں جان بوجھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا کہ اسے نزدیک سے دیکھ سکوں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ اس کے جسم سے بڑی سخت بدبو آرہی تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ بدبو اسکی جرابوں سے آرہی تھی یا اسکے میلے دانتوں سے۔ کلچرل فرنٹ کی ادبی نشست میں نردوش نے اپنا ایک افسانہ پڑھا اور میں اسکے جسم سے آنیوالی بدبو بھول کر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں کھو گیا۔ اس واقعہ کو آج ۴۴ ! سال ہو گئے اور مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس کے اس افسانے پر کس طرح تنقید ہوئی ان دنوں اپنے ہاں "ترقی پسندی" زوروں پر تھی اور افسانوں میں بھی براہ راست مزدور کی عظمت اور سرمایہ داروں کی مذمت کا مطالبہ بڑی شدت کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ نردوش کا شمار بڑے سرگرم کامریڈوں میں ہوتا تھا۔ میری نردوش سے اس پہلے تعارف کے بعد وہ نہ جانے کہاں کھو گیا۔ کبھی کبھی ادبی محفلوں میں اس کا تذکرہ چھڑ جاتا اور اس کے متعلق عجیب و غریب قیاس آرائیاں ہوتیں۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ وہ جالندھر سے شائع ہونے والے کمیونسٹ اخبار "نیا زمانہ" کا سب ایڈیٹر ہو گیا ہے۔

کمیونسٹوں سے نردوش کی وابستگی کمیونزم کے گہرے مطالعہ کی بجائے اپنی تنگدستی اور مفلسی کے خلاف ایک شدید احتجاج کا نتیجہ تھی۔ نردوش ہر متوسط طبقے کے نوجوان کی طرح ان دنوں اپنی غربت سے اتنا بیزار نہیں تھا جتنا سماج کے کچھ آسودہ حال افراد کی آسودگی سے ۔۔ اسی بیزاری نے اس کی تعلیم بھی مکمل ہونے نہیں دی اور وہ اپنے ارد گرد کی دنیا سے الجھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

ادبی محفلوں، مشاعروں اور سماجی تقریبات میں آوازیں کسنے اور ہلڑ بازی مچانے سے اس کے ذوقِ بغاوت کی تسکین ہونے لگی۔ جالندھر میں "نیا زمانہ" کی ادارت کے دوران اس نے زندہ رہنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے۔ وہ جب دو سال بعد وہاں سے لوٹا، اس کے پاس واپسی کے کرائے کے علاوہ تجربات کی ایک بہت بڑی پوٹلی تھی۔ کمیونسٹوں سے اس کے والہانہ عشق کی آگ کچھ سرد پڑ چکی تھی۔ اجنبی دیار میں سرینگر کی گندی نالیوں اور اندھیری کوٹھریوں کی یاد نے اس میں ایک نئی جوت جگائی۔ اُسے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اسے کشمیر سے بے پناہ محبت ہے اور وہ کشمیر سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن کشمیر میں زندہ رہنے کیلئے بھی دو وقت کی روٹی مل جانا چاہیئے اور دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے زندگی کے سامراج سے سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ ان دنوں میر غلام محمد راجپوری، لیجسلیٹو اسمبلی کے موجودہ اسپیکر "جہانِ نو" کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالتے تھے۔ زردوش نے "جہانِ نو" کی ادارت سنبھال لی۔ لیکن راجپوری صاحب کی نگرانی میں قلم کو ہر ہر قدم پر احتیاط اور مصلحت کی زنجیر کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑا۔ زردوش کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ اپنے سینے کی دہکتی ہوئی آگ کے شعلوں سے پورے سماج کو جھلسا کر رکھ دے۔ انہی دنوں ایک کشمیری پنڈت نوجوان نے اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر دوسری شادی رچانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کی وجہ سے کشمیری پنڈتوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ زردوش نے اس سماجی بے انصافی اور "مردانہ بہیمیت" کے خلاف آواز بلند کی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے جاتی کا لیڈر بن گیا، اُسے جذبات ابھارنے اور لہو گرمانے کے سبھی گر آتے ہیں۔ اس لیے اس مہم کے دوران وہ سب لیڈروں پر چھا گیا۔ ہر روز اس کی تقریر سننے کے لیے شہر کے مختلف حصوں میں ہزاروں کا مجمع لگا رہتا۔

وہ عورت کی بے کسی، مظلومی اور مجبوری کی آواز بن گیا اور کچھ دنوں کے لیے زندگی کے سارے دکھ بھول کر اپنی حسرتوں سے انتقام لینے میں مشغول ہو گیا، لیکن زندگی کو فریب دے کر بھاگنا اتنا آسان نہیں جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے کچھ ہی دن بعد اس سے الجھنے کے لیے نردوش پھر تنہا رہ گئے۔ تقریروں سے نہ عوام کا پیٹ بھرتا ہے اور نہ مقرر کا۔ پیٹ کے ایندھن کے لیے روپیہ چاہیئے اور نردوش کے پاس اسی ایک چیز کی کمی تھی۔ اس کی صلاحیتوں سے خوف کھا کر کچھ عاقبت اندیشوں نے اس کی مجبوری کا سودا کیا اور اسے ایک حقیر مشاہرے پر روزنامہ "خدمت" میں ایک بار پھر مقید کر دیا گیا۔ نردوش نے اپنے تجربات کی روشنی میں محنت اور ریاضت سے اپنے فرائض انجام دینے کی کوشش کی، لیکن اُسے جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ اس کی محنت اور ریاضت کا صلہ اس کی بجائے اس کے رقیبوں کو ملتا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ جب تک وہ دوسروں کے لیے کام کرتا رہے، اس کی حیثیت ایک ایسے مزدور کی سی ہوگی، جس کی محنت اور عرق ریزی سے تعمیر شدہ مکان میں اُسے خود گھسنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ خاکستر میں دبی ہوئی بغاوت کی چنگاریاں ایک بار پھر شعلہ بن گئیں۔ وہ خدمت سے مستعفی ہو گئے اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے "یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ" کی بنیاد ڈالی۔ فرنٹ کی سرگرمیاں ایک پریس کانفرنس، ایک پمفلٹ کی اشاعت اور دہلی کی سیر سے آگے نہ بڑھ سکیں اور چند ہی دنوں بعد اس کے اکثر ساتھیوں نے وقت کے سامراج کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور نردوش ایک بار پھر تنہا رہ گئے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم اور فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی اور اب اُس میں مزید جدوجہد کا حوصلہ باقی نہ رہا۔ ہر چیز سے اُس کا اعتقاد اٹھ گیا۔ زندگی نے اس سے بڑے سنجیدہ مذاق کیے تھے وہ جب بھی بلندیوں کی طرف مائل پرواز ہوتا، اس کے پر کٹ جاتے۔ وہ جب بھی اپنی 'انا' کی حفاظت کے لیے

اپنی زنجیریں کاٹنے کی کوشش کرتا، تو اس کا سارا بدن لہولہان ہو جاتا۔ مسلسل ناکامیوں اور پیہم حوادث سے اس میں ایک CYNICISM پیدا ہو گیا اور وہ اس کٹھور سماج کو پانی پی پی کے کوسنے لگا۔ وہ اب صرف زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زندگی کو بدلنے کی خواہش مر گئی۔ چاند کی تلاش کرنے والا موم بتی کو اپنی منزل سمجھ کر بیٹھ گیا۔ مایوسی، افسردگی اور ندامت کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا نردوش ایک دن بخشی غلام کے آستانے پر پہنچ گیا۔ بخشی صاحب کو زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے میں ایک عجیب طرح کی لذّت کا احساس ہوتا تھا۔ چاہے وہ زخم خود ان کے دیئے ہوئے کیوں نہ ہوں۔ نردوش کی حالت پر ترس کھا کر انہوں نے اُسے سہارا دیا اور وہ ریڈیو کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ نردوش پچھلے کئی برسوں سے اب ریڈیو کشمیر سے ہی وابستہ ہیں اور اس کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی زندگی کے ساتھ مزید تجربے کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ریڈیو سے وابستگی کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ نردوش نے اپنے فن کی طرف توجہ کرنا شروع کر دی پچھلے چند سال میں اس کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو گئے ہیں۔ وہ برابر کہانیاں لکھتا جا رہا ہے۔ اس کی کہانیاں موضوع کے تنوع اور بیان کی دلکشی کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ اُسے کہانی کہنے کا گُر آتا ہے۔ اسی لیے وہ احباب میں داستان گو کی حیثیت سے مشہور ہے۔ نردوش بہت سی غیر معمولی صلاحیتوں کا مقبرہ ہے۔ یہ کشمیری ادب کی بدقسمتی ہے کہ نردوش کی تعلیم نامکمل اور اس کا مطالعہ ادھورا رہ گیا ہے۔ اس میں تقریر، تحریر اور اظہارِ خیال کی بے پناہ قوت ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اس سے کوئی بھرپور استفادہ نہیں کر سکا ہے۔ وہ بے حد ذہین اور بلا کا طرار آدمی ہے اس کی بجھی ہوئی آنکھوں سے اب بھی کبھی کبھی غیر معمولی ذہانت کے کوندے لپکتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے

کوئی چونکا دینے والی بات کہنا چاہیئے اس لیے وہ اکثر ایسی حرکتیں کرتا ہے جس سے اس کی شخصیت کا غیر معمولی پن ظاہر ہو۔ وہ اپنے سینے میں ایک بڑا دردمند دل رکھتا ہے۔ کسی زخمی چڑیا کو سڑک سے اٹھاکر پورا دن اس کی تیمارداری میں صرف کرے گا۔ لیکن دوست و احباب کو چونکا دینے کے لیے وہ کسی بھکاری کی جیب کاٹنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کی یہ "سنسنی خیزی" اس کی کہانیوں سے نمایاں ہے، جب سے وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گیا ہے اس نے سیاسی مباحث میں حصہ لینا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن سیاست سے اس کی دلچسپی بدستور قائم ہے۔ اس کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟ اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر آپ کمیونسٹ ہیں تو وہ انٹی کمیونسٹ، اگر آپ کانگریسی ہیں، تو وہ انٹی کانگریسی۔ غرض اس کے سیاسی عقائد کا انحصار اس کے اپنے خیالات کی بجائے آپ کے اعتقادات سے ہے۔ وہ ہر بات کی مخالفت کرے گا۔ یہ اس کی سیاست ہے اور یہ اس کے عقائد پر ایک بات طے ہے کہ وہ فرقہ پرست نہیں ہے۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کا بڑا بے رحم نقاد ہے وہ اگر اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور چیز سے عشق کرتا ہے تو وہ ہے کشمیر۔ کشمیر کے میں اکثر وہ بڑی بڑی مبالغہ آمیز باتیں کر جاتا ہے۔ وہ کشمیری زبان کو دنیا کی سب سے بڑی اور زیادہ ترقی پسند زبان قرار دیتا ہے اور اپنے آپ کو کشمیری زبان کا سب سے بڑا افسانہ نگار۔ تردوش بہت اچھا دوست ہوتے ہوئے بھی دوست احباب میں مقبول نہیں۔ وہ زیادہ دیر تک کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی انانیت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ وہ ہر اس برات پر پتھر پھینکتا ہے جس کا وہ خود دولہا نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ مسلسل ناکامیوں نے اُسے ایک احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے اور اس احساس کی آسودگی کے لیے وہ ہر روز نئے پیکر تراشتا رہتا ہے۔ اس کی انگریزی محض واجبی ہے لیکن وہ بڑی پابندی سے انگریزی

فلمیں دیکھتا ہے۔ اُس کا جنسی تجربہ صرف اپنی ازدواجی زندگی تک محدود ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو ماہر جنسیات سمجھتا ہے۔ اس کا مطالعہ درجن بھر کتابوں تک محدود ہے۔ لیکن جب وہ کسی مسئلے پر گفتگو کرے گا تو ایسا محسوس ہوگا کہ اُسے دنیا بھر کے فلسفے پر عبور حاصل ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور فطانت کے بل بوتے پر بہت سے اجنبیوں کو بڑے بڑے مغالطے دے چکا ہے۔ زردوش بڑی مایہ ناز شخصیت کا مالک ہے اور اس کے متعلق ایک رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ اس کی شخصیّت کی قوس قزح میں بہت سے رنگ ہیں اور جو انسان زندگی میں رنگوں کی اہمیت اور اُن کے حسن کا قائل ہے۔ اُسے زردوش کی شخصیت بڑی پیاری اور دل آویز معلوم ہوگی۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء

درصاحب

اونکار ناتھ در کو سمجھنے کے لیے نفسیات میں ایم۔ اے کرنا ضروری نہیں۔ لیکن نفسیات کا طالب علم ہونا ضروری ہے، ان کی شخصیت کئی پردوں میں چھپی ہوئی ہے اور اصلی درصاحب تک پہنچنے سے پہلے کئی نقلی درصاحبوں کے ہاں سے گذرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات مسافر کسی خوشگوار سائے کو منزل سمجھ کر اپنا سفر ختم کر دیتا ہے لیکن جب تجربات کی آنچ سے یہ سایہ پگھلنا شروع ہوتا ہے تو مسافر کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ اصلیت کی تلاش میں چند قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ درصاحب کی سیاسی زندگی بہت مختصر ہے۔ لیکن سیاسی شخصیتوں سے ان کی وابستگی نے اُن کی مختصر سیاسی زندگی کو بھی غیر معمولی اہمیت بخشی ہے۔ وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں بڑے ہنگامہ خیز قسم کے نوجوان تھے اور کمیونزم سے بے حد متاثر، سیاسی تحریکوں سے ان کی دلچسپی جذباتی نہیں بلکہ فکری عمل کی پیداوار تھی۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے سرمایہ دار نظام کو بدل کر ایک اشتراکی سماج قائم کرانے کی خواہش فطری تھی لیکن درصاحب نے اس خواہش کو ایک فکری نظام کا تابع بنا دیا۔ پھر کچھ دیر بعد زندگی کی رعنائیوں نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچنا شروع کر دی اور وہ زندگی کو بدلنے کی بجائے زندگی کے پیچ و خم میں کچھ اس طرح اُلجھ گئے کہ پھر کبھی زندگی کو بدلنے کا

خواب دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ کالج کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ایف۔اے پاس کرنے کے بعد تحریکِ کشمیر چھوڑو میں گرفتار ہو گئے۔ اور بی۔اے پاس کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ رہائی کے بعد جب شب گزیدہ سحر نمودار ہوئی تو درصاحب بھی طلوع ہو گئے اور شری جانکی ناتھ زتشی کی رفاقت میں زندگی کی منزلیں طے کرتے گئے۔ محکمۂ اطلاعات میں ملازم ہو گئے، اور اپنی ذہانت اور محنت سے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر کسی کی نظر ہی نہ پڑنے دی۔ نامکمل تعلیم اور ڈگری نہ ہونے کے باوجود اپنی قابلیت کے بل بوتے پر بیورو کریسی میں اپنی جگہ بنائی۔ انگریزی کے اچھے طالب علم تھے اور بڑے بڑے ڈگری یافتوں سے بہتر انگریزی لکھتے ہیں۔ شیخ صاحب کی نظروں میں بھی چڑھ گئے۔ ۱۹۵۳ء میں ان کی گرفتاری سے قبل دہلی میں انفارمیشن آفیسر تھے اور ان کے زبردست مدّاح ۔۔ ۹ اگست کے بعد جب انہیں واپس سری نگر بلایا گیا تو بہت دنوں تک شیخ صاحب کی معصومیت، ان کی عظمت اور ان کی دیانت کا راگ الاپتے رہے، لیکن جلد ہی درصاحب کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے اور نئے حالات میں زندہ رہنے کے لیے طالب علمانہ جوش و خروش سے زیادہ استادانہ مصلحت پسندی کا اپنانا ضروری ہے۔ اس مرحلے پر زتشی صاحب کو بھی تنکوں کے سہارے کی ضرورت تھی۔ درصاحب کو انگریزی ہفت روزہ "کشمیر پوسٹ" کی ادارت سے منسلک کیا گیا۔ اور درصاحب اور زتشی صاحب "کشمیر پوسٹ" کے ذریعے ایک ایسے کشمیر کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ جس میں شیخ محمد عبداللہ نام کے کسی شخص کا وجود ہی نہ تھا۔ درصاحب کے انقلابی ذہن کو ملازمت کا چسکا پڑ چکا تھا اس لیے وہ جلد ہی سرکاری جرنلزم سے علیحدہ ہو کر سرکاری ملازمت میں آ گئے، اور ایک بار پھر دہلی میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہو گئے۔ دہلی میں انفارمیشن افسر کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب رہے۔ درصاحب کی شخصیت میں

میں نرمی، انکساری، اداکاری، دور اندیشی اور ہر ایک کو خوش رکھنے کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ اُن کی وجہ سے وہ دہلی کے صحافتی حلقوں میں بے حد مقبول ہو گئے۔ انہیں بخشی صاحب کا مکمل اعتماد حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دہلی سے سرینگر تبدیل کر دیئے گئے۔ سرینگر میں اُن کی ہر دلعزیزی اور ان کی اداکارانہ صلاحیتیں بڑے سخت امتحان میں پڑ گئیں۔ دہلی کی وسیع دنیا میں انسان کی بڑی سے بڑی خامی بھی چھپ سکتی ہے۔ وہاں زندگی اتنی وسیع ہے کہ کسی سے ٹکرانے کا زیادہ احتمال نہیں، سرینگر کی تنگ اور پُر پیچ گلیوں میں۔ انسان کہاں تک اپنا دامن بچاتا رہے۔ یہاں ٹکراؤ ناگزیر ہے جلد ہی در صاحب کے وجود کے اندر چھپے ہوئے تضادات نمایاں ہونے لگے۔ وہ دس سال تک انفارمیشن افسری کرتے کرتے تھک گئے تھے وہ اپنی قربانیوں اور اپنی خدمات اور صلاحیتوں کی قیمت چاہتے تھے۔ بخشی صاحب نے انہیں اپنا پرائیویٹ سیکریٹری مقرر کر دیا اور در صاحب اپنی کامیابی اور کامرانی پر نازاں نظر آنے لگے۔ ظلِ سبحانی کی قربت کی آنچ نے در صاحب کو خوش اخلاقی، نرم روی اور انکسار سے بے نیاز کر دیا۔ ان کے مزاج میں ایک تُندی اور تیزی آ گئی۔ ان کے لہجے کی شائستگی اور ان کی خوش گواری (جو ان کا سب سے بڑا اثاثہ تھا) حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔ وہ بخشی غلام محمد کے ارد گرد ایک فصیل بن کر کھڑے ہو گئے اور ایسا لگ رہا کہ انہوں نے بخشی غلام محمد کو اپنی پناہ میں لے لیا ہو۔ اور وہ اُسے دنیا کی نظروں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہوں۔ در صاحب کو بخشی صاحب کی شفقت پر اعتماد تھا۔ اس لیے کبھی باتوں باتوں میں ان سے اختلاف کرنے کی جرأت بھی کرتے تھے لیکن اس اختلاف میں وہ رکھ رکھاؤ اور وضع داری ہوا کرتی تھی۔ کہ یہ اختلاف سے زیادہ اتفاق دکھائی دیتا۔ بخشی صاحب اور در صاحب کے قرب و اختلاط نے کئی دلوں میں حسد کی آگ بھڑکا دی۔ راویوں کا کہنا ہے کہ بخشی صاحب کے مشیرِ اعلیٰ شری جانکی ناتھ

زُنّشی کو بھی یہ "اتحاد" "خطرناک" نظر آیا اور جوں جوں بخشی غلام محمد کے اقتدار کا سورج غروب ہونے لگا در صاحب بھی ان کے اعتماد سے محروم ہوتے گئے۔ آخر انہیں دربار شاہی سے الگ کر کے کسی بے ضرر محکمے میں ڈپٹی سیکریٹری مقرر کر دیا گیا۔ ان دنوں در صاحب اپنی سیکنڈ ہینڈ موٹر میں اپنی شکست کا ہارن بجاتے ہوئے اکثر شہر کی سڑکوں پر پریشان حال نظر آتے ہیں۔ اسی دوران میں زمانہ ایک اور چال چل گیا۔ شمس الدین صاحب کی سہ ماہی وزارت کا سوانگ رچایا گیا اور در صاحب نے شری ڈی پی در کو اپنی وفاداریوں کا مرکز بنا دیا۔ صادق وزارت قائم ہوتے ہی در صاحب پھر اپنے مرکز کی طرف لوٹ آئے۔ وہ صادق صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہو گئے اور آج بھی اسی عہدے پر فائز ہیں۔ در صاحب کو اپنی دیانت اور اپنے سلیقے کے بل بوتے پر آجکل صادق صاحب کا اعتماد حاصل ہے اور وہ اکثر صادق صاحب کی محفلوں میں بیٹھ کر بخشی صاحب کے لطیفے سنایا کرتے ہیں۔

در صاحب کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ہے ان کی قوتِ برداشت، وہ اپنے آپ کو سات پردوں میں چھپائے رہتے ہیں۔ یہ اندازہ کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کے دل کے اندر کیا ہے۔ وہ اپنے بدترین دشمنوں سے بھی اس محبت اور خلوص سے پیش آتے ہیں۔ جس طرح اپنے بہترین دوستوں سے جس آدمی سے وہ بے پناہ نفرت کرتے ہیں اکثر اسے اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایک اچھے رفیق اور دوست ہیں، لیکن شاہی درباروں سے وابستگی نے ان پر مصاحبت پسندی کی صیقل چڑھا دی ہے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

جے۔این۔زتشی

زتشی صاحب کا خاکہ "آئینہ" میں بہت پہلے چھپ جانا چاہیئے تھا، لیکن میں نے جان بوجھ کر اسے ٹال دیا تھا بات دراصل یہ ہے کہ زتشی صاحب میری "کمزوری" ہیں اور کوئی شخص اپنی کمزوری کا اشتہار نہیں دینا چاہتا۔ ان کے متعلق عوام الناس کی رائے یہ ہے کہ وہ بڑے بے ایمان، ابن الوقت، چالاک اور عیار آدمی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ عوام کی رائے کچھ زیادہ مبالغہ آمیز بھی نہیں۔ لیکن جن لوگوں کو زتشی صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے یا اُن کے ساتھ کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی بے ایمانی ابن الوقتی، چالاکی اور عیاری کے باوجود بڑے دلچسپ آدمی ہیں ان سے دور رہ کر ان سے نفرت کرنا بہت آسان ہے لیکن ان کے قریب جا کر ان سے پیار نہ کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ اتنے ذہین، طباع، زندہ دل اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی ہیں کہ ان کی شخصیت کے باغ و بہار میں کھو کر ان کی کمزوریوں پر نگاہ ہی نہیں پڑتی۔ وہ اتنے باریک بین، نکتہ شناس اور ماہر گفتگو CONVERSATIONALIST اور ماہر نفسیات ہیں کہ اگر انہوں نے سرکاری ملازمت کی سنہری زنجیروں کو قبول نہ کیا ہوتا، تو وہ بڑے کامیاب سیاستداں ہوتے یہ الگ سوال ہے کہ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انہوں نے بڑے بڑے سیاسی داؤ پیچ کھیلے ہیں۔

زتشی صاحب کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ ایام طالب علمی میں ہی ان کی ذہانت

کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔ تقریر کے میدان میں تو وہ جم نہ سکے، لیکن تحریر کی دنیا میں انہوں نے جب ہی اپنا مقام بنا لیا تھا۔ ان دنوں اچھی انگریزی لکھنا اور بولنا قابلیت کا معیار سمجھا جاتا تھا اور نُرتشی صاحب اس معیار پر پورا اترتے تھے۔ انہی دنوں وزیر داخلہ ڈی۔ پی در اور نُرتشی صاحب کے درمیان معاصرانہ چشمک شروع ہو گئی اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ چشمک اب بھی جاری ہے۔ کشمیر کے سیاسی افق پر نُرتشی صاحب کا طلوع ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے ہوا۔ اپنی ذہانت، فطانت اور زورِ قلم کے سہارے جلد ہی انہوں نے قومی قیادت کی صفوں میں اپنی اہمیت اور افادیت کو منوا لیا۔ میں نے پہلی بار ان کا نام "خدمت" (انگریزی) کے صفحات پر دیکھا ہے۔ تحریکِ کشمیر چھوڑ دو کے دوران گرفتار کر لیے گئے اور قبائلی حملے کے بعد ریڈیو کشمیر کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہو گئے۔ اب ان کا نام شیخ صاحب کے قریب ترین معتمدین میں لیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۳ء تک یہ شیخ صاحب کے مشیر خاص خاص رہے اور ۱۹۵۳ء میں اسی الزام میں انہیں گرفتار بھی کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد بخشی صاحب کے ذاتی اخبار کشمیر پوسٹ کی ادارت سنبھالی اور اپنی تیکھی تحریروں اور دلکش اداؤں سے بخشی صاحب کا من موہ لیا۔ بخشی صاحب قسطوں میں مہربان ہونا نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے مہربان ہوتے ہی نُرتشی صاحب کو ڈائریکٹر جنرل انفارمیشن، اسٹیشنری اور پرنٹنگ بنا دیا۔ نُرتشی صاحب نے اس نوازش اور عنایت کا حق ادا کر دیا۔ اور ڈائریکٹر اطلاعات کی حیثیت سے بخشی صاحب کا وہ بت تراشا کہ آج دس سال بعد بھی جبکہ بخشی صاحب کا وجود مٹ گیا ہے۔ نُرتشی صاحب کے تراشے ہوئے بت کی پرچھائیاں فضا میں لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ دیکھتے دیکھتے بخشی صاحب کے معتمدِ خصوصی کا رتبہ حاصل کر گئے۔ ان کے مشورے کے بغیر بخشی صاحب کوئی کام نہ کرتے۔ بعض مصاحبین کو نُرتشی صاحب کا یہ عروج ایک آنکھ

نہ بھایا۔ پیرزادہ غلام احمد (چیف سیکریٹری) اور زتشی صاحب میں اقتدار اور قربت کے لیے ایک خونریز خوفناک جنگ شروع ہوگئی۔ بخشی صاحب دونوں کی اس چشمک سے لطف اندوز ہوتے۔ کبھی زتشی صاحب پر زیادہ لطف و کرم ہوتا۔ اور کبھی پیرزادہ صاحب اس کے سزاوار ہوتے۔ اس طرح سالہا سال آپس کی یہ "آخری لڑائی" چلتی رہی۔ زتشی صاحب کے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ وہ بہت بڑے ماہر نفسیات ہیں۔ وہ بخشی صاحب کی ہر کمزوری سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے بخشی صاحب سے ٹکرانے کی بجائے انہی کے رنگ میں رنگنے کا راستہ اختیار کر لیا۔ آدمی چونکہ بے حد ذہین اور بذلہ سنج ہیں۔ اس لیے بخشی صاحب کا مکمل اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بخشی صاحب اپنی کابینہ کے وزیروں سے زیادہ ان کی عزت اور ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔

اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں بخشی صاحب کو خود زتشی صاحب کے عروج پر رشک آنے لگا۔ انہیں ڈائریکٹر اطلاعات کے عہدے سے ہٹا کر دہلی میں ٹریڈ کمشنر مقرر کر دیا گیا۔

بخشی صاحب کے زوال کے بعد زتشی صاحب کی تقدیر پر کچھ عرصے کے لیے گرہن چھا گیا۔ بخشی صاحب کے ستائے ہوئے ڈیموکریٹک لیڈر جو زتشی صاحب کو اس کا EVIL GENIUS سمجھتے تھے، انتقام پر تل گئے۔ انتقام کے لیے انٹی کرپشن کیس کا بہانہ بھی ہاتھ آ گیا۔ ان لیڈرانِ کرام نے زتشی صاحب کے جادو کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔ زتشی صاحب کے جان کے دشمن جلد ہی اُن کے محافظ بن گئے اور آج زتشی صاحب مسجد کے زیرِ سایہ اپنے خرابات کو سجائے ہوئے نظر آ رہے ہیں، یہ زتشی صاحب کی بے پناہ صلاحیتوں ان کے سلیقے اور اُن کی قوتِ بقا کا اعلان ہے۔

زتشی صاحب کا سب سے بڑا اثاثہ اُنکا SENSE OF HUMAR ہے۔ وہ دُنیا پر ہنسنے

کے ساتھ ساتھ اپنے پر ہنسنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنے لئے سرکاری ملازمت کا پرخار راستہ اختیار کر لیا ہے اور کشمیر میں اپنی ملازمت کے تحفظ کے لیے سیاسی لیڈروں کو بھی خوش رکھنا ضروری ہے۔ اسی لیے بعض لوگوں کو ان کا ہر دور میں زندہ رہنا کھل جاتا ہے۔ زتشی جیسے آدمی کسی دور میں نہیں مرتے، وہ کسی کی مروت یا سہارے کی بنا پر نہیں اپنی ذہانت اور صلاحیت کے بل بوتے پر زندہ ہیں اور ہر حکمراں کو ذہین اور باصلاحیت لوگوں کی ضرورت رہے گی۔

زتشی صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں، وہ ہر موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔ وہ دوست بنانا جانتے ہیں اور دشمن کو زیر کرنا بھی۔ افسر کی حیثیت سے ریاست کے پورے انتظامیہ میں ان جیسے کم ہی افسر ہوں گے۔ وہ اپنے ماتحت کا گلا نہیں دباتے، اپنی افسری کا رعب جمانے کے لیے اسے غلام نہیں بناتے بلکہ اُسے کام کرنے کی آزادی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ کام کرتے میں آسودگی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں اور زتشی صاحب اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود بڑی محبوب شخصیت ہیں۔ مجھے "تعمیر" کے مدیر کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ زتشی صاحب کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے مجھے بڑی تکلیفیں دی ہیں، لیکن اگر مجھے آج بھی اپنا افسر منتخب کرنے کا حق دیا جائے تو میں زتشی صاحب ہی کا انتخاب کروں گا۔

زتشی صاحب کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ وہ براہِ راست سیاست میں حصہ لیتے تو ڈی، پی در جیسے شعبدہ بازوں کی جان پر بن آتی۔ وہ صحافت کا راستہ اختیار کرتے، تو اُن کا شمار یقیناً ملک کے مقتدر صحافیوں میں ہوتا۔ لیکن آزادی کے بعد سے وہ پسِ پردہ تار ہلانے پر ہی قناعت کر بیٹھے اور نتیجہ

یہ کہ ان سے کم تر درجے کے لوگ ان کے حاکم بن گئے۔ زتشی صاحب نے چھوٹی چھوٹی مسرّتوں اور رعایتوں کے لیے اپنے مستقبل کا سودا کرلیا ہے۔ اور میرے نزدیک یہ ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

ست پال ساہنی

ست پال ساہنی کو سزا ہو گئی۔ انہیں سری نگر سے تبدیل کر کے پٹنہ میں تعینات کر دیا گیا ہے۔ پورے دو سال تک وہ اپنی بریت اور بے گناہی کا مقدمہ لڑتے رہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بخشی غلام محمد سے گہری وابستگی کا داغ دو برس میں بھی نہ دھل سکا۔ اسے کہتے ہیں سیاہ بختی۔ سابق ٹرانسپورٹ کمشنر ایس۔ کے رینہ نے اپنے سیاہ ماضی کو ایک ہفتے میں ڈرائی کلین کر کے "صفاشین" کر دیا اور بچارے ساہنی دو سال میں بھی اپنے دامن کے دو ایک داغ نہ ہٹا سکے۔

ست پال ساہنی کو سری نگر کے صحافی سیاسی اور سماجی حلقوں میں ستی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ پچھلے اٹھارہ برس سے سری نگر میں انگریزی روزنامے "ٹائمز آف انڈیا" کے مقامی نمائندے تھے اور ان کے چلے جانے سے شہر کی سماجی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے اخباری نمائندے ہیں، لیکن اپنے اخلاق، شرافت، ملنساری اور آداب و اطوار سے شہر کی پوری سماجی زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد سے سری نگر اخباری نمائندوں کی جنت بن گیا۔ یہاں بیرونی اخبارات کے نمائندوں کی وہ آؤ بھگت ہوتی ہے جو پہلے وائسرائے کے لیے

مخصوص ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۵۳ء کے بعد قومی پریس کے مقامی نمائندوں کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ بخشی غلام محمد نے اس ملک میں اپنی IMAGE بنانے کے لیے مقامی نمائندوں سے رابطہ بڑھایا۔ اور اس طرح اخباری نمائندے بھی سیاسی لیڈروں کی طرح woo کیے جانے لگے۔ ستی ان خوش قسمت نمائندوں میں سے تھے جنہیں بخشی صاحب نے اپنے قرب خاص کے لیے چن لیا تھا۔ ستی نے اپنی محنت اور اپنے سلیقے سے اس انتخاب کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ۱۹۵۷ء میں جب صادق صاحب اور ان کے ساتھی بخشی صاحب سے علیحدہ ہو گئے تو ستی نے اپنی وفاداری نبھانے کے لیے اپنے قلم اور اپنے اخبار کو بخشی صاحب کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ "ٹائمز آف انڈیا" کو بخشی صاحب کا ترجمان بنانے میں ستی کا کتنا دخل ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ستی کی تحریر کا ایک ایک لفظ بخشی صاحب کی حمایت اور صادق صاحب کی مخالفت میں تھا۔ ستی کی جانفشانی اور جانبداری نے بخشی صاحب کی شفقت کو اور بھڑکا دیا۔ اب ان کا شمار رفیقان خاص میں ہونے لگا۔ پبلسٹی اور پروپاگنڈا کے ہر منصوبے میں ستی کی حیثیت ایک اعلیٰ مشیر کی ہو گئی۔ وہ ہر سرکاری کمیٹی کے غیر سرکاری ممبر بنا دیئے گئے۔ جشن کشمیر کا ہنگامہ ہو یا یوم الحاق کا پروگرام، ستی کی شرکت اور شمولیت ناگزیر تھی۔ تازہ ترین اور خصوصی خبریں حاصل کرنے کے لیے انہیں "مرکز خاص" سے جو رسائی تھی کسی اور اخبار نویس کو نہ تھی۔ ستی کے اس عروج نے اخبار نویس برادری کو برہم کر دیا۔ بہت سے اخباری نمائندے بخشی صاحب سے صرف اس لیے برگشتہ ہو گئے، کہ وہ ستی کو زیادہ لفٹ کیوں دیتے تھے۔ برادری کے سب لوگ ستی سے جلنے لگے۔ اور اکثر انہیں ان کی پیٹھ پیچھے گالیاں دی جاتیں لیکن اقتدار اعلیٰ سے قربت کا نشہ

ایسا نہیں کہ دو چار گالیوں سے ہرن ہو جائے۔ ستی عروج کی سیڑھیاں طے کرتے رہے، ان کا سماجی مرتبہ بڑھتا گیا اور وہ شہر کی سماجی زندگی پر چھا گئے۔ بخشی صاحب کے زوال کے بعد ستی نے نئے حکمرانوں کے ساتھ رابطہ بڑھانا شروع کیا اور کچھ عرصہ کے لیے یہ دکھائی دینے لگا کہ "سب کچھ ٹھیک ہے" لیکن ستی کے غیر متوقع تبادلے نے اس اندازے کو غلط ثابت کر دیا۔

ستی سا ہنی بے حد شریف، با اخلاق اور مہذب آدمی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے، کہ ان میں جینے کا سلیقہ ہے۔ ان کی زندگی میں اتنی باقاعدگی ہے کہ وہ آدمی سے زیادہ ایک مشین معلوم ہوتے ہیں۔ اُن سے بات کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ETIQUETTE کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہو۔ وہ کبھی کسی سے اُلجھتے نہیں، وہ اپنی بات منوانے کے لیے کبھی مصر نہیں ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں اکثر ہر کسی سے اتفاق کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ انہیں کسی لحاظ سے کبھی ذہین نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بڑے کامیاب آدمی ہیں۔ وہ بظاہر زاہد خشک معلوم ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے مزاج میں خاصی رنگینی اور رندی ہے لیکن اس رندی اور رنگینی میں اتنا سلیقہ رکھ رکھاؤ اور وضعداری ہے کہ اس کے باوجود آدمی شریف معلوم ہوتے ہیں۔ ستی کو دوست بنانے اور دوستی نبھانے کا گر بھی آتا ہے۔ اسی لیے ان کے دوستوں میں وہ بھی شامل ہیں، جو دراصل ان کے دشمن ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ستی کی کامیابی کا اہم راز ان کی زبان میں ہے۔ وہ وہی بات کہتے ہیں، جو آپ سننا چاہتے ہوں۔ ستی کو تصویر کھینچنے کا بے حد شوق ہے۔ اور وہ اس پر خاصہ پیسا صرف کرتے ہیں۔ ان کے پاس نایاب تصویروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور بعض احباب کا خیال ہے کہ ستی کی آمدنی کا ایک معقول حصہ اپنی تصویروں

پر منحصر ہے۔

ستی ساہنی کے چلے جانے سے شہر کی کئی محفلیں بے رونق ہو گئی تھیں۔ اور خود ستی بھی کشمیر کے باہر زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے "ٹائمز آف انڈیا" کی نوکری چھوڑ دی اور اس شرط پہ یو۔ این۔ آئی کی ملازمت اختیار کر لی کہ انہیں سری نگر میں پوسٹ کر دیا جائے گا۔ وہ سری نگر لوٹ آئے، اور ایک بار پھر وہ اجڑی ہوئی بستی آباد ہو گئی جو ان کے جانے کے بعد سوگوار نظر آتی تھی، لیکن اب یہ دنیا ان کے لیے بہت بدل گئی ہے ان کے چاہنے والوں کو زمانے کی گردش نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ابھی تک نئے دور کے بادشاہوں سے قرب حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ اسی لیے ستی ماضی کی خوبصورت یادوں کو دہرا کر حال کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بچارا ستی!

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(یہ مضمون دو قسطوں پر مشتمل ہے)

عبدالقادر دلوان (مرحوم)

بجلی فضا کو چیر کر کب کی گذر گئی
سینے سے ہم نے ہاتھ اُٹھایا نہیں ہنوز

"عبدالقادر دلوان مر گئے"، میری چھوٹی بہن نے روتے ہوئے کہا اور میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ "وہ مر کیسے سکتا ہے۔ اس نے کل میرے ہاں آنے کا وعدہ کیا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ عبدالقادر دلوان اپنے قول کا پکا نہیں۔ یہ یقیناً اس کے کسی دشمن کی اُڑائی ہوئی افواہ ہے۔" میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر ان کا کوئی دشمن بھی تو نہیں۔ اُسے کسی سے دشمنی کرنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ وہ تو صرف دوستوں اور دوستی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ ہو نہ ہو دلوان کے موت کی خبر صحیح ہو۔ دل کے دروازے پر ایک خوفناک حقیقت نے دستک دی اور لمحہ بھر کے لیے خدا کی خدائی پر ایمان متزلزل ہو گیا۔ دلوان کا کھلتا ہوا چہرہ، اس کی عقابی آنکھیں اس کے ہونٹوں پر مچلتی ہوئی سنجیدہ مسکراہٹ اور اس کے حیات افروز قہقہوں کی آواز ذہن کے پردے پر ایک تصویر اُبھر آئی اور میں سوچنے لگا کہ سیمابی فطرت کا یہ گبرو نوجوان، جس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا۔ اُس کی بے قرار روح، کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتی تھی، جسے دیکھ کر زندگی کی بے ثباتی کا

احساس کچھ دیر کے لیے مٹ جاتا تھا۔ وہ موت کے فولادی پنجے کی گرفت میں کیونکر آگیا۔ وہ ملک الموت کو اپنے سامنے دیکھ کر بھاگ کیوں نہیں گیا؟ اس نے اپنی شیریں کلامی اور جادو بیانی سے موت کے فرشتے کو اپنے بس میں کیوں نہیں کیا؟ دیوان چاہتے تو یہ سب کچھ ہو سکتا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوان نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ اپنے محبوب گھوڑے پر سوار ہو کر ملک الموت کی خدمت میں پیش ہوئے۔ دوست احباب نے روکا، تو اُن سے جلد ہی واپس آنے کا وعدہ کیا۔ گھوڑے نے آگے چلنے سے انکار کر دیا، تو اُسے چابک مار کر آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا اور شوپیان سے چار میل دور رتنی پورہ کے گاؤں میں منزلِ مقصود سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر موت نے ان کا خیر مقدم کیا۔ دیوان پر جو گذری سو گذری، سوچتا ہوں کہ دیوان کی زندگی چھینتے ہوئے خود ملک الموت پر کیا گذری ہو گی؟

عجب اتفاق ہے کہ عبدالقادر دیوان کو ہر وہ شعر پسند تھا جس میں "بجلی" کا لفظ سلیقے سے استعمال کیا گیا ہو۔ یہ غالباً ۱۶، ۱۷ برس کا واقعہ ہے کہ ان کے ایک ہم جماعت محمد عبداللہ شیدا نے انہیں اپنا شعر سنایا ؎

بجلی فضا کو چیر کر کب کی گذر گئی
سینے سے ہم نے ہاتھ اُٹھایا نہیں ہنوز

دیوان اس شعر پر اس بری طرح فریفتہ ہو گئے کہ اُن کی دیوانگی کا عالم کچھ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ بار بار اس شعر کو پڑھتے، خود داد دیتے اور ہم سے داد وصول کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ اُن کے اس شعر میں ایک پوری حکایت بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ آج خود دیوان اس شعر کی تفسیر بن گئے ہیں۔ ان کی زندگی کا افسانہ آسمانی بجلی کے ایک کوندے سے جل کر خاک ہو گیا اور ہمیں سینے سے ہاتھ اُٹھانے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔ آج سے تیرہ برس پہلے اپنے ایک

خط میں دیوان صاحب نے اس شعر کی بڑی تعریف کی تھی ؎

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کون جانتا تھا کہ بجلی سے دیوان کی یہ ذہنی وابستگی اِن کے انجام سے ایک شاعرانہ تعلق رکھتی تھی۔ ۴ مئی کو ساڑھے چھ اور سات بجے کے درمیان ایک کھلے میدان میں بجلیوں کے اس عاشق پر بجلی گر پڑی اور وہ ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو گیا۔

عبدالقادر دیوان کون تھے ؟ اور میں اُن کی یاد میں خون کے آنسو کیوں رو رہا ہوں ؟ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تعلق صرف مجھ سے ہے یا زیادہ سے زیادہ اُن دوست احباب سے جو دیوان کو قریب سے جانتے تھے اور یہ دیوان کی بہت بڑی بد قسمتی ہے کہ بہت سے لوگ ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ اس تعارف کا مقصد کسی حد تک اس بد قسمتی کی تلافی کرنا ہے۔

عبدالقادر دیوان شوپیان سے ایک میل کے فاصلے پر چوگام کے ایک تجارتی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا گھریلو ماحول خالص تاجرانہ تھا لیکن عبدالقادر پر بچپن ہی میں شعر و ادب کی دیوی نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔ اس کے بزرگ اس کی خداداد ذہانت اور صلاحیتوں کو اپنی تجارت کے فروغ کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے اور عبدالقادر اپنی روح اور ذہن کی پیاس بجھانے کے لیے کتابوں کی دنیا میں کھو جانا چاہتا تھا۔ گردشِ ایام نے عبدالقادر کی بجائے اُن کے بزرگوں کا ساتھ دیا۔ وہ بڑی بے جگری، بڑے عزم اور ارادے کے ساتھ لڑتا رہا، لیکن بالآخر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ منشی پریم چند، اقبالؔ، مومنؔ، غالبؔ اور فیضؔ کا عاشق زار راولپنڈی اور دلی کی میوہ منڈیوں میں اپنی کھوئی ہوئی جنت کی تلاش کرتا رہا۔ پھولوں کا رسیا، پھلوں کی دنیا میں کچھ اس طرح کھو گیا کہ اُسے پھر کبھی شہر

آرزو کی یاد ہی نہ آئی۔ عبدالقادر دیوان ایک ہارا ہوا سپاہی تھا، اور مورخ ہارے ہوئے سپاہی کی داستان نہیں لکھتا، فاتح جرنیلوں کے قصے بیان کرتا ہے، لیکن میں انسان کو اس کی فتوحات سے نہیں اس کے خوابوں سے ناپتا ہوں۔

عبدالقادر کا سینہ اتنے حسین خوابوں کا مدفن ہے کہ اس پر ہزاروں تعبیریں قربان کی جاسکتی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر، ذہنی طور پر ایک افسانہ نگار اور انداز نگارش کے اعتبار سے ایک نقاد تھا۔ اگر اس کی بے رحم دنیا اسے تجارت کی سنگلاخ وادیوں میں نہ دھکیلتی تو وہ اردو کا بہت بڑا شاعر اور نقاد ہوتا۔

(دوسری قسط)

وہ سخن فہم تھا غالبؔ کا طرفدار نہ تھا

عبدالقادر دیوان کے ادبی مذاق، ان کے انداز نگارش، اسلوب، تحریر اور تنقیدی شعور کو اس پس منظر میں دیکھئے کہ وہ صرف میٹرک تک پڑھے تھے۔ انہیں ہائی اسکول تک بھی باقاعدہ طور کسی اسکول میں تعلیم پانے کا موقع نہ ملا تھا۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کی مرضی کے خلاف ان سے چوری چھپے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور جوں توں کر کے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ لیکن اس کے بعد ان کی کچھ نہ چلی۔ آئندہ تعلیم جاری رکھنے کے لیے سرینگر آنا ضروری تھا اور سرینگر میں ان کے اخراجات برداشت کرنے والا کوئی نہ تھا ناچار انہیں اپنی آبائی دوکان پر بیٹھ کر دکانداری سیکھنا پڑی۔ چائے، کپڑے، ہلدی اور نمک کے کاروبار میں ادبی ذوق کی تسکین اور تخلیقی صلاحیتوں کی جلا کہاں ممکن ہے۔ لیکن عبدالقادر دیوان سب کی نظریں بچا کر چوری چھپے

اپنے ذوقِ سلیم کو بھی آسودہ کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ باقاعدہ طور صرف میٹرک تک پڑھا لکھا ہونے کے باوجود وہ ہمارے آج کے ایم، اے پاس نوجوانوں کے مقابلے میں عالم اور فاضل نظر آتے ہیں۔ میں بہت سے ایسے اردو ایم، اے پاس "استادوں" کو جانتا ہوں جو میٹرک پاس دیوان کی ادبی بصیرت و اُن کی نظر اور آگہی کا مقابلہ تو کیا، اس کا صحیح طور مطالعہ بھی نہیں کر سکتے۔ ان دنوں غالب پرستی عام ہے۔ ہمارے بہت سے نوجوان اور بزرگ صرف اس لیے غالب کے گرویدہ ہو گئے ہیں کہ اہلِ نظر نے غالب کے سر پر شہرتِ عام اور بقائے دوام کا تاج رکھا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ان کی شہرت سے مرعوب ہیں۔ ان کی غالب فہمی اور غالب شناسی کا منبع خود غالب اور اس کا کلام نہیں۔ بلکہ شارحین غالب کی وہ طالبِ علمانہ تفسیریں ہیں جو خالص تجارتی نکتہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ میرا دیوان بھی غالب کا عاشق تھا لیکن اس کا عشق کسی شرح یا تفسیر کا مرہونِ منت نہ تھا۔ اس کی بلند نظری، بلند ذوقی اور خوش مذاقی کی پیداوار تھا وہ غالب شناس بھی تھے اور غالب فہم بھی۔ وہ غالب کی ہر ادا سے بخوبی واقف تھے، (اور اس کی معنی آفرینی، نکتہ سنجی، معاملہ بندی) اور نازک خیالی کے گرویدہ، اُسے نہ صرف خود غالب تک رسائی حاصل تھی، بلکہ مجھ جیسے کم مایہ اور کم سواد طالب علموں کو غالب کی عظمت سے روشناس کرانے کا سلیقہ بھی۔ سولہ برس قبل کی بات ہے میں غالب کے نام سے آشنا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے اشعار میرے فہم و ادراک کی گرفت میں نہ آتے تھے اپنی کم علمی اور تہی مائگی کا اعتراف کرنے کی بجائے میں غالب کو ایک تیسرے درجے کا شاعر ثابت کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ میں نے ایک ادبی رسالے میں فرحت کانپوری کی ایک نظم دیکھی۔ نظم بے حد سطحی اور عامیانہ تھی۔ لیکن مجھے غالب کی برائی کرنے کا موقعہ مل گیا۔ میں نے فرحت کو غالب کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ میں نے دیوان کو یہ نظم بھیج کر اُسے دعوتِ مناظرہ دی۔ اس سلسلے میں دیوان اور

میرے درمیان جو خط و کتابت ہوئی۔ اس میں سے میں دیوان کا صرف ایک خط نقل کر رہا ہوں۔ کہ ان کی غالب فہمی اور غالب شناسی کا اندازہ ہو جائے۔

" خدائے شہرت بن کر علامہ غالبؔ کے تاج شہرت سے اپنے فرحت کو چمکانے کی آرزو رکھنے والے۔

" مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔ آپ کے طویل خط کا مطالعہ کرنے پر کیا پایا؟ علامہ غالبؔ کو اپنے مقام سے گرانے کی مجنونانہ کوشش اور بے چارے فرحت کو دوسروں کے پروں کے سہارے اس کی اپنی استعداد سے بالاتر اڑانے کی سعی بے ہنگام۔ دوسروں سے اپنا نرالا نظریہ منوانے کے لیے غیر ضروری کاوش اور جابرانہ اصرار۔ اپنے صحیح مقام سے گر کر حق کی حمایت کرنے والوں پر آوازیں کسنا اس کے علاوہ :۔

آج کے خط میں آپ کا اشہبِ قلم نہایت تیزی کے ساتھ رواں ہے۔ دورانِ تحریر نادانستہ آپ چند حقائق کا اعتراف بھی کر چکے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں کچھ اور عرض کروں۔ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ نقشِ اول اور نقشِ ثانی کے جو معانی آپ کے ذہن میں ہیں، نہیں بلکہ ان دو الفاظ کا جو مطلب آپ نے لیا ہے حقیقت کے برعکس ہے چنانچہ سابقہ اور آج کے خط مذکورہ الفاظ کو غلط رنگ میں استعمال کرنے کی وجہ سے اختلاف وسیع ہو گیا تھا۔ آپ کا طرزِ استدلال بتا رہا ہے کہ نقشِ اوّل نقشِ ثانی کی بہ نسبت بہتر ہوتا ہے یا زیادہ تعریف و توصیف کا مستحق ہے۔ حالانکہ یہ شرف نقشِ ثانی کو نقشِ اوّل کے مقابلے میں حاصل ہے۔ اردو میں ہر جگہ اسی طرح مستعمل ہے۔ یا زبانِ اردو نے اسے اسی طرح پر قبول کیا ہے۔ آپ نے اپنے سابقہ خط میں یعنی اولین قصیدۂ فرحت میں مذکورہ دو الفاظ کو غالب اور داغ کا ذکر کرتے ہوئے استعمال کیا تھا۔ چونکہ غلط انداز میں استعمال کیے گئے تھے۔ اس لیے معنی بھی الٹا دے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اور داغ کی تفریق کو آپ کے سامنے واضح کرنے پر مجبور ہو گیا۔

غالبؔ کو ہدف ملامت بنانے سے قبل آپ اُن اُمور کو نظر انداز کیوں کرتے ہیں کہ غالبؔ کی شاعری کس زمانے کی پیداوار ہے۔ اُس کے اپنے حصّے میں کونسا زمانہ آیا ہے۔ وہ انگلینڈ یا جرمنی کی کسی یونیورسٹی کا سند یافتہ نہیں۔ بلکہ اٹھارویں صدی کی کسی خس پوش جھونپڑی کے نیچے کسی دقیانوسی طرز کے اُستاد سے لکھنے پڑھنے کی سُدھ بُدھ حاصل کر لیتا ہے۔ آپ ہی کے قائم کردہ معیار کے مطابق ادب خلا میں نہیں بلکہ زندگی کے بطن سے جنم لیتا ہے تو اندازہ کیجیئے اس وقت شاعری کی حالت کیا تھی، شاعروں کا طائرِ تخیل کتنی بلندی پر پرواز کرتا تھا اور پھر مرزا صاحب کا موازنہ اُن کے ہم عصروں اور دسوائے اقبالؔ کے کیوں کہ اقبالؔ کا راستہ جدا ہے) بعد کے شعرا سے کیجیئے۔ اس کے ساتھ یہ اندازہ بھی کیجیئے، کہ اگر اقبالؔ کے حصّہ میں بھی یہی زمانہ آیا ہوتا اور اسی طرز پر ان کی تربیت ہوئی ہوتی تو اقبالؔ کے خیالات کیا ہوتے۔

کچھ اور کہنے سے پیشتر یہ طے کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ شاعری کیا ہے؟ شاعری حیات کی ترجمان ہے۔ یا واضح الفاظ میں اس کی تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سُننے یا مشاہدہ کرنے یا کسی واقعہ کے پیش آنے سے درد و رنج، عشق محبت، جوش مسرت، نفرت، ہمدردی یا دشمنی وغیرہ وغیرہ کی جو حالت دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کو جذبات کہتے ہیں۔ ان جذبات کے ادا کرنے کا نام ایک مخصوص و دل نشین پیرایہ میں شاعری ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جو اثر بیان کرنے والے کے دل میں ہے وہی سننے یا پڑھنے والوں پر بھی چھا جائے۔

جی ہاں! میں آپ کے ساتھ متفق ہوں کہ ادب برائے زندگی ہونا چاہیئے۔ نہ کہ ادب برائے ادب۔ اگرچہ اب ایک نیا نظریہ بھی جنم لے رہا ہے اور وہ ہے ادب برائے اسلام۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اصول ماننے کے بعد بھی آپ غالبؔ سے اس قدر

خفا کیوں ہیں۔ کہ انہیں شاعروں کے قصر میں مسند تو کجا پناہ بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ جب سے اس نظریہ کو اپنایا گیا ہے۔ اُسی وقت سے غالب آسمانِ شاعری پر ایک درخشندہ تارے کی طرح چمک رہے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں زندگی کے لیے کیا ہے؟ سُنئے، جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس صنف میں سے زندگی کو کیا ملنا چاہیئے بلند نظری، صبر و استقلال، عالی ظرفی اور خود اعتمادی کے درس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے اور وہ ہے انسان کی ایک نرالی قسم کی بھوک کا ازالہ یا ایک عجیب سی تشنگی جسے روح محسوس کرتا ہے (اور میرا ذہن اس کا کوئی مناسب نام تجویز کرنے سے قاصر ہے) اس کو سیراب کرنے کی شدید ضرورت۔ جب سے انسان نے شعور کی سرحد پر قدم رکھا ہے۔ اُس نے اپنی اس طبعی مانگ کو محسوس کیا ہے اور اُسے پورا کرنے کے لیے کامل تر انسانوں نے مواد فراہم کیا ہے۔ غالب کی شاعری انسان کے اسی درد کا علاج ہے۔ یہ ایک باشعور انسان کی فطری بھوک ہے۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے وہ اُسے خاص خاص وقتوں پر محسوس کرتا آیا ہے۔ محسوس کر رہا ہے اور مستقبل میں محسوس نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ایک تھکے ہوئے دماغ کو جس طرح نیند بحال کر دیتی ہے۔ اسی طرح ایک پریشان دل اور مضمحل روح کو غالب کی شاعری آسودگی بخشتی ہے۔

غالب کیا ہے؟ اگر یہ جاننے کی آرزو ہے تو دل و دماغ سے خدا واسطے کے بیر کا جذبہ نکال کر سر کو ٹھنڈے پانی سے دھو کر سکون کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر کلام غالب کو پڑھیئے اور ان رموز کو دیکھیئے جو ادب اور نازک خیالی کی جان ہیں۔ اگر آپ محسوس کریں گے اور ضرور کریں گے بشرطیکہ تمہیں طبع رسا اور ذوقِ سلیم حاصل ہوں کہ یہ شاعر جو آج سے تقریباً ایک سو سال قبل گذرا ہے۔ تمہارے ان خیالات، جذبات اور لطیف احساسات کی ترجمانی کر چکا ہے۔ کہ جنہیں آپ کا نطق کجا آپ کی عقل بھی

آپ کے تخیل کی دنیا میں ترتیب دینے سے عاری ہے۔ زمانہ گذر چکا ہے کہ وہ آپ کے دل میں چھپے ہوئے اُن تاثرات کی عکاسی کر چکا ہے۔ جو اس وقت آپ کے دھڑکتے ہوئے دل میں موجود ہیں اگر تمھارا احساس زندہ ہو اور تمھارے شعور میں کچھ جان ہو تو وفورِ حیرت سے تمھاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ مجسم پیکرِ داد بن جاؤ گے، غالب زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے خواہ وہ معمولی ہوں یا اہمیت کے قابل اور زمانے کی نت نئی کروٹوں سے جو ہر انسان کو زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں اور اُن کی طرف التفات کئے بغیر آگے بڑھتے ہیں۔ قابلِ قدر اور سبق آموز نتائج اخذ کر جاتا ہے اور یہی ایک فلاسفر کی شان ہے۔

غالبؔ کو بے غیرت کے نام سے خطاب کر کے جس طرح تم نے حقیقت کا خون کیا ہے اور انصاف کا منہ چڑایا ہے تمہارا ہی حصّہ ہے۔ سنو! غالبؔ جبکہ اپنے آپ کو رب المعبود کے حضور میں پاتا ہے۔ اس حال میں کہ پیٹھ پر اپنی سیاہ کاریوں اور بدعنوانیوں کا بوجھ ہے۔ جن کا خمیازہ قانون قدرت کے مطابق اُسے ضرور بھگتنا ہے۔ جانتے ہو کہ وہ اپنے گناہوں کا خمیازہ کس طرح چکانا چاہتے ہیں؟ غالباً نہیں سنو۔

ناکردہ گناہوں کی حسرت کی بھی ملے داد؟
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اے خدا!! اگر تیرے قانون کے مطابق گناہگار کو کئے ہوئے گناہوں کی سزا ملنی لازمی ہے تو انصاف یہی ہے کہ مجھے ان گناہوں کی داد دی جائے۔ جن کے کرنے کی مجھے آرزو تھی لیکن دل کی دل ہی میں رہ گئی یعنی میں انہیں کر نہ سکا جو گناہگار یا مجرم ہونے کی صورت میں اتنا نڈر اور بے باک ہوگا کیا اُسے بے غیرت کہا جا سکتا ہے۔

کیا کہا؟ غالب چوگام اور چوہن کی الماریوں اور ٹینگ محلہ کے صندوقوں میں چھپ کر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ زوردار الفاظ کے گولے پھینک کر آپ غالب کی عظمت

کو مٹا نہیں سکتے۔ شاعر زندگی اقبالؔ نہ صرف ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے بلکہ وہ بھی وہاں سے استفادہ کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کا مشہور شاعر فانیؔ اس وقت جبکہ ادب برائے زندگی کے اصول کو اپنایا جا چکا تھا۔ اسی شراب سے ایک دنیا کو مدہوش کر کے اپنے پیچھے ایک ایسی شہرت چھوڑ گئے جس کی چمک اب بھی آپ کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے۔ حسرتؔ موہانی غالبؔ جی کی شراب کو نئے پیمانوں میں انڈیل کر تمام باذوق اصحاب سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے۔ دور حاضر کے مقبول ترین شاعر جگرؔ مراد آبادی کو ایک نیا انداز اختیار کیے ہوئے ہے۔ لیکن ان کا طائر تخیل بھی اسی محور کے گرد گھوم رہا ہے۔ یہ غالبؔ کی دائمی زندگی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ اگر آپ نے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کی قسم کھا رکھی ہے تو ناقابل علاج امر ہے۔

آپ نے کہا ہے کہ آپ کے پیش کردہ اشعار اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں لیکن فرحتؔ کے ساتھ مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ کیوں کہ ان کے راستے جدا جدا ہیں۔ اور مختلف چیزوں کا موازنہ کرنا نادانی ہے۔ بجا فرمایا آپ نے۔ مجھے آپ کے ساتھ اتفاق ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے حقیقت کی طرف آنے کی پیشقدمی کی ہے لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ غالب اور فرحتؔ کو ٹکرانے کی بیوقوفی کیوں کر رہے ہیں۔ حالانکہ دونوں دو مختلف آب و ہوا کے پروردہ ہیں۔ دونوں الگ الگ شاہراہوں کے مسافر ہیں۔ ہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں میں سے اپنے اپنے طرز ہی میں سہی اوج کمال پر کون پہنچا۔

باقی رہے آپ کے فرحتؔ صاحب، عطر اللہ مرقدہٗ ان کا کلام ہمارا اصلی موضوعِ سخن ہے۔ بے چارے غالبؔ کو تو آپ خواہ مخواہ درمیان میں گھسیٹ لائے۔ نہ جانے کس جنم کا بدلہ لینے کے لیے:۔

آپ نے ہم پر فرحتؔ صاحب کی ذات پر ناجائز حملے کرنے کا الزام لگایا ہے۔

آپ کی منطق بھی ساری دنیا سے نرالی ہے۔ بھلا ہمیں آپ کی ذات سے کیا واسطہ؟ ہمارے سامنے فرحت جو کچھ ہے اُس کا کلام ہے۔ فرحت کا نام لے کر جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا واسطہ براہِ راست اُس کے کلام سے ہے اور اس کے متعلق رائے طلب کرنے والے تو آپ ہی ہیں اب اگر کلام فرحت کے متعلق ہماری لب کشائی کو آپ اس کی ذات پر کیچڑ اچھالنے سے تعبیر کریں گے تو اس کا ہمارے پاس کیا علاج ہے؟ اب اگر ہماری رائے آپکی رائے سے مطابقت نہیں رکھتی تو صرف اِسی وجہ کی بنا پر ہم گالیوں کے مستحق کیوں ٹھہرے، ہماری سمجھ سے بعید ہے۔

کلام فرحت میں سے جن اشعار کو ہم نے لائق تعریف یا قابل قدر ٹھہرایا ہے وہ چند ہی شعر تو ہیں۔ آپ اسے کل پر نافذ کر کے اپنی گرتی ہوئی دیوار کو بچانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہی الفاظ کو توڑ مروڑ کر پیش کر کے۔ اپنے فرحت کو بچانے کیلئے آپ ان ہی سے ڈھال کا کام لینا چاہتے ہیں۔ لیکن دیکھئے، یہ ہتھیار اوچھے ہیں۔ کلیتاً بددیانتی اور پھر اُن چند اشعار کے متعلق بھی عرض کیا گیا ہے۔ کہ گو تخیل اچھا ہے اور انداز دل نشین لیکن نیا نہیں بلکہ پائمال اور فرسودہ ہے، جو چیز ہم فرحت کے پیش رووں سے سن چکے ہیں۔ جن زمینوں پر ہل چلایا جا چکا ہے، جن بلندیوں پر پیش قدمی کرنے والے جھنڈے گاڑ چکے ہیں۔ اس پر سر دھننے اور ناچنے کی کوئی ضرورت ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ چچوڑی ہوئی ہڈیوں اور چبائے ہوئے نوالوں کو چبانے میں اگر آپ کو لطف آرہا ہے تو آئے، لیکن ہمیں تو اس میں کوئی نئی بات نظر نہیں آتی۔ میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دو شعر پڑھ چکا ہوں۔ اور آپ اعتراف بھی کر چکے ہیں۔ گو بہ مجبوری۔ جناب فرحت کے باقی جتنے بھی اشعار ہیں۔ مجموعی طور فنی لحاظ سے کسی تعریف و توصیف کے مستحق نہیں ہیں۔ باقی رہا ان کا مفہوم تو جناب بار بار پڑھنے کے بعد بھی آپ کے فرحت صاحب ہمیں اپنے ساتھ متفق کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ رہا سوال کیوں اور کیسے؟ سنئے۔

اپنے فرحت کے پہلے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔ شاعر ایک عجیب دعا مانگ رہا ہے۔ وہ

دامن پھیلا رہا ہے۔ قوتِ برداشت اور توفیق خمیازہ کے لیے جو تقریباً ایک ہی چیز ہے حالانکہ ایک عالی ظرف انسان اِن قوار کو خود اعتمادی اور صبر و استقلال کی بدولت اپنے وجود کے اندر پیدا کرتا ہے اور آپ جانتے ہیں، خود اعتمادی اور صبر و استقلال باہر سے نہیں آئیں گے۔ جی ہاں، حوادث پر قابو مانگنے کی دعا بہت اچھی ہے اور مجھے بے حد پسند ہے۔ واقعی حوادث کے سامنے انسان لاچار ہے، بے بس ہے۔ اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک بلند و برتر ہستی کے سامنے امداد کے لیے دامن پھیلانے پر مجبور ہے۔

سعی پیہم کے ہوتے ہوئے ناکامیوں کا اندیشہ کرنا پست ہمتی کی دلیل ہے اور پھر ناکامیوں کو زندگی سے علیحدہ ہی کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ہار جیت، کامیابی اور ناکامی کا خوشی اور غم کی طرح زندگی کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر مصرعہ اس طرح ہوتا تو خیال ہے کہ فرحت صاحب کی لاج کسی حد تک بچتی نظر آتی "سعی پیہم میں مگر مایوسیاں پیدا نہ ہوں"۔

یہی مضمون فرحت صاحب کے پیش رو ادا کر چکے ہیں۔ (درد کا حد سے گزر جانا ہے دوا ہو جانا)

جہل سے ہنر کا آفتاب چمکنا کتنی بھدی اور نامانوس ترکیب ہے۔ یہ ترکیب ہی بذاتِ خود اپنے خالق کے اناڑی پن، بے عملی فرمائی کا اعلان کر رہی ہے۔

"شیب کی مجبوریوں پر ہی اکڑتا ہے شباب" کتنا تنگ ظرف ہے تمھارا یہ فرحت بھی ایک سلیم الفطرت انسان کے لیے اس کا خیال بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ شباب جسے شیب کی مجبوریوں کو دیکھ کر اپنی اصلاح کی فکر نہیں ہوتی یا عبرت حاصل نہیں کرتا بلکہ اکڑتا ہے۔ یا شیب کا مضحکہ اڑاتا ہے قابلِ نفرت ہے۔

اقبالؔ کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اختلاف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہاں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔

یہ آپ نے ہمیں دعا سے منکر ہونے کا تمغہ کیسے عطا کیا۔ ترچھی چالیں چلنا کوئی آپ سے سیکھے۔ جناب ہماری گذارش ہے کہ جناب فرحتؔ صاحب جس چیز کے لیے دست بہ دُعا ہیں اِس کی تلاش اُنہیں اپنے وجود کے اندر کرنی چاہیئے۔

جی نہیں ہمارے نکتہ نظر کے مطابق اقبال خطرے میں نہیں ہاں اگر آپ کا فرحت ہو تو ہمارے پاس اس کا علاج نہیں۔ اقبال نے بھی بارگاہِ ایزدی میں دامن پھیلایا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں اور آپ کے فرحتؔ بھی التجا کر رہے ہیں، لیکن دونوں کی دُعاؤں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا شاعرِ ملت اور جناب فرحتؔ کی ذات میں، ذات سے میری مراد ان کے کلام سے ہے۔

جوانوں کو پھر آہ سحر دے پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے میرا نورِ بصیرت عام کر دے

حکیم مشرق کو آہ سحر گاہی کی لذت حاصل ہے اور قوم کے تمام جوانوں کو اس متاع سے بہرہ ور کرنے کے لیے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے۔ وہ خود شاہین کے بال و پر کا مالک ہے اور اس وقت کو دیکھنے کی آرزو سے بے قرار ہے جب اس کی قوم کے جوان بھی اُس کی طرح انسانیت کی رفعتوں پر پرواز کر رہے ہوں۔ وہ خود چشم بینا تو رکھتا ہے۔ اس کی روشنی حجاب کے پردوں کو چیر کر حقیقت کو سامنے دیکھ رہی ہے اور اب دستِ سوال دراز کر رہا ہے خالقِ کائنات کے حضور میں کہ اس کی ملّت کو بھی اس دولت سے مالا مال کرے۔ اُسے جو کچھ اپنے کو حاصل ہو چکا ہے، وہ اُسے دوسروں کو عطا کرانے کے لیے ایک بلند و برتر ہستی کے سامنے سائل کی حیثیت سے کھڑا ہے اور جو مصرعہ آپ نے پیش کیا ہے "یارب دلِ مسلم کو ......" وہاں بھی اس مردِ خود آگاہ کا دل ایک آرزو کی تپش کی گرمی سے مالا مال ہے۔ اپنی ساری قوم کو ہمکنار دیکھنے کے لیے ایک مختار مطلق سے ملتجی ہے۔

اس کے مقابلے میں بے چارے فرحتؔ کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ قوت برداشت

اور صبر و استقلال سے بھی تہی دامن ہے۔ اسی فرحت کو آپ سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔
آپ کہتے تو ہیں کہ میں بحث برائے بحث نہیں کرنا چاہتا پھر بھی آپ یہی کیے جا رہے ہیں۔ فرحت کے کلام کے متعلق ہماری رائے دریافت ہوئی، ہم نے گوش گذار کی تو آپ ہی کہیے اس پر بگڑنے کی وجہ کیا تھی۔ ہم نے آپ کی عینک سے دیکھنے کے لیے پٹہ کب لکھ دیا تھا۔ کیا ہم آزادی سے اپنی رائے کے اظہار کا حق نہیں رکھتے۔
جی نہیں آپ صرف دسویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ افسانے لکھتے ہیں۔ آپ کے افسانے کو سن کر آپ کے کالج کا اردو لیکچرار آپ کو پریم چند کا جانشین بنا رہا ہے۔ آپ کے اشعار کالج میں زبانِ زدِ عام و خاص ہیں۔ اتنا ہی نہیں آپ نہ جانے کیا کیا ہیں اور ہم آپ کی رائے کو صرف ایک دسویں جماعت کے لڑکے کی رائے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم اسے ایک ادیب کی رائے ہی کہیں گے۔ (باقی پھر کبھی)

آپ کا

عبدالقادر دیوان

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

موتی لعل مصری

"تم موتی لال مصری کو جانتے ہو؟" میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا۔

"وہ غلیظ کمیونسٹ جو آٹھ آٹھ دن بعد داڑھی بناتا ہے اور سڑکوں پر آوارہ پھرتا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بڑا خطرناک آدمی ہے، ایک چلتا پھرتا بم جو معلوم نہیں کب اور کہاں پھٹ جائے۔ میرے دوست نے اپنا لہجہ پُراسرار بناتے ہوئے کہا۔

یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے، ان دنوں مصری صاحب کا ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے ممتاز لیڈروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے چہرے سے ایک نامعلوم وحشت ٹپکتی تھی اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ میں نے اُسے کبھی مُسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بات بھی کم کرتا تھا اور باوجود اس کے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ہمیں کبھی ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں اُن دنوں سرکاری ملازم تھا اور مصری مجھے "سامراجی ایجنٹ" تصور کرتے تھے۔ میں انہیں خطرناک قسم کا کمیونسٹ سمجھتا تھا اور اُن دنوں سرکاری ملازم سے یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ ہر کمیونسٹ کو گالی دے کر اُس سے دور رہنے کی کوشش کرے گا۔

ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس بخشی غلام محمد کے خلاف نیشنل کانفرنس قیادت کے ایک بااثر گروہ کی بغاوت کا اعلان تھا۔ لیکن بخشی صاحب نے اُسے کمیونسٹوں

کی سازش قرار دے کر ڈیموکریٹک لیڈروں کو بڑی مشکل میں مبتلا کر دیا تھا۔

موتی لال مصری جوان دنوں کامریڈ مصری کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ پارٹی کے ممتاز رکن تھے۔ وہ ڈیموکریٹک کانفرنس کے آفیشل آرگن "کشمیر" کے ایڈیٹر بھی تھے۔ اسی طرح جموں کے رام پیارا صراف، کرشن دلوی سیٹھی، وید پال دیپ جیسے مشہور کامریڈ ڈیموکریٹک کانفرنس کے سرگرم رکن تھے۔ خواجہ غلام محمد صادق اور اُن کے ہم نوا اپنے کمیونسٹ ہونے سے بار بار انکار کرتے رہے، لیکن کانفرنس میں "کامریڈوں" کی بھرمار تھی۔ اس لیے ان کے انکار کے باوجود ڈیموکریٹک کانفرنس بحیثیت مجموعی ایک کمیونسٹ جماعت تصور کی جاتی رہی۔ اور ۱۹۵۹ء میں جب صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں نے سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ڈیموکریٹک کانفرنس کو ختم کر کے ایک بار پھر بخشی غلام محمد کی قیادت کو خراج عقیدت پیش کرنے کا فیصلہ کیا تو کامریڈ مصری اور دوسرے کامریڈوں نے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء میں بخشی غلام محمد کی مخالفت کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لیے پتھر کے کلیجے اور لوہے کے دل گردے کی ضرورت تھی۔ موتی لال مصری اگر چاہتے تو ان کے لیے "وزارت" کے دروازے کھُل سکتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے عقیدے اور اصول کی خاطر اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس طرح پھولوں کی سیج پر چلنے کی بجائے کانٹوں کا راستہ اختیار کیا۔

مصری کی زندگی، تلخیوں، مایوسیوں اور نامرادیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ وہ اپنے بچپن ہی سے کمیونسٹ ہو گیا ہے اور بچپن کے کمیونسٹوں میں یہ برائی ہوتی ہے کہ ان کے کمیونزم میں بچوں کی سی ضد بھی شامل رہتی ہے۔ مصری نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اُسے کمیونسٹ مینی فیسٹو زبانی یاد ہے۔ مارکس، لینن اور اینجیلز کی بھی تصانیف پر اس کی نظر ہے، لیکن ایک اچھے کمیونسٹ

کی طرح اس کے علاوہ اس نے کچھ نہیں پڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک کٹر ہندو یا ایک کٹر مسلمان کی طرح کٹر کمیولسٹ ہے۔ سیاست کے نشے نے اس کی باقاعدہ تعلیم بھی مکمل نہیں ہونے دی۔ کالج میں داخل ہونے کے فوراً بعد ہی اُسے جیل جانا پڑا۔ اور اس طرح وہ بی، اے بھی پاس نہ کرسکا۔ ۱۹۴۶ء میں تحریک "کشمیر چھوڑدو" کے سلسلے میں جیل جانے کے بعد وہ باقاعدہ نیشنل کانفرنس میں شریک ہوگیا۔ ۱۹۵۹ء میں ڈیمو کریٹک کانفرنس سے صادق صاحب اور اس کے ساتھیوں کی علیحدگی نے مصری کو شدید جذباتی صدمہ پہنچایا۔ وہ اکثر سڑکوں پر حیران و پریشان اور افسردہ و پشیمان پھرتا نظر آتا۔ اس پر جیسے کوئی بہت ہی ناگوار حقیقت آشکارا ہوگئی تھی۔ اُسے یہ یقین ہوگیا کہ کشمیر میں ہر ترقی پسند لیڈر دراصل قوم کی ترقی سے اپنی ترقی کا خواہاں ہے۔ اس کے بعد مصری نے اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنے کا منصوبہ بنایا اور دو سال میں پرائیویٹ طور پر بی، اے پاس کیا اور پھر "آئینہ ساز" کے ساتھ علی گڑھ سے ایل، ایل، بی پاس کرلیا۔

میں نے پچھلے کئی سال سے مصری کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور اس کے متعلق میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئی ہیں۔ وہ ایک آئیڈیل قسم کا طالب علم ہے۔ بہت ہی محنتی اور جفاکش! مجھے حیرت ہے کہ وہ اس عمر میں بھی سکول کے بچوں کی طرح بڑی باقاعدگی سے اپنا "سبق" یاد کرتا ہے وہ ہماری جماعت کا سب سے معزز اور قابل طالب علم تھا اور تعجب ہے کہ اتنا قابل، اتنا محنتی اور اتنا ذہین لڑکا "انقلابی" کیونکر بن گیا! اُسے تو کسی سکول کا ماسٹر ہونا چاہیئے تھا۔ وہ طبعاً بہت شریف آدمی ہے۔ غلاظت سے اُسے کچھ فطری لگاؤ سا ہے۔ صاف کپڑے پہننا یا روزانہ داڑھی بنانا وہ بورژوا عادت سمجھتا ہے۔ یونیورسٹی بھر میں اس کا کمرہ بے ترتیبی، غلاظت اور افراتفری میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کی زندگی میں

ایک عجیب طرح کی پراگندگی ہے اس کے ذہن پر اس کا ماضی اس بری طرح سوار ہے کہ اس کی پوری زندگی پر اس کی چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ جب اپنے مستقبل کے متعلق سوچتا ہے، تو اکثر اپنے ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے۔ اسے اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس کے ہم سفر جو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے آج بڑی بلندیوں پر ہیں اور وہ ایک نئے سفر کی ابتدا ر کر رہا ہے۔ مصری کو اپنے عقائد کی صحت پر پورا اعتماد ہے وہ آج بھی کمیونزم کو دنیا کے تمام مسائل کا حل سمجھتا ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوا ہے کہ اب رفتہ رفتہ جدوجہد پر سے اس کا اعتقاد اٹھتا جا رہا ہے۔ ماضی کی ناکامیوں اور احباب کی "دغا بازیوں" نے اُسے محتاط بنا دیا ہے۔ وہ کہتا تو یہی ہے کہ اس کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں لیکن دراصل اس کا مقصد کسی قسم کی خطرناک سیاست سے لاتعلقی ظاہر کرنا ہے۔

مصری ایک بہت ہی دلچسپ نفسیاتی مطالعہ ہے۔ بخشی غلام محمد نے اس کو خریدنے کے لئے کتنی ہی کوششیں کیں لیکن مصری کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی وہ آج بھی چاہے تو اسے بڑے سے بڑا عہدہ مل سکتا ہے لیکن وہ "بکاؤ" مال نہیں یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ آپ مصری صاحب کو ایک چائے کی پیالی کے لیے دو میل کا سفر کروا سکتے ہیں۔ دو سگریٹ پلانے کے لیے آپ سے دن بھر اپنے پیچھے پیچھے پھرا سکتے ہیں۔ آپ سے وسکی کا ایک پیگ پینے کے لیے وہ آپ کی خوشامد بھی کرے گا اور گھنٹوں آپ کا پیچھا کرتا رہے گا۔ وہ ازلی بھوکا ہے۔ اس کی بھوک کبھی نہیں مٹتی۔ سگریٹ چائے اور شراب یہ مصری صاحب کی کمزوریاں ہیں۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

رام ناتھ

رام ناتھ اب کہاں ہے ؟ مجھے معلوم نہیں ۔ سننے میں آیا ہے کہ اس نے جموں میں ایک دُکان کھول رکھی ہے، لیکن میں نے اُسے کبھی اس دُکان پر بیٹھے نہیں دیکھا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ سادھو بن گیا ہے اور کسی مندر میں بیٹھ کر دن رات پوجا پاٹھ کرتا رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ صحیح ہو۔ بہت سے لوگوں کی طرح شاید وہ اس انتظار میں ہو، کہ گذرے ہوئے دن پھر لوٹ آئیں گے!

ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کے لیے رام ناتھ نام محتاج تعارف نہیں پچھلے دس برسوں میں جب کبھی بخشی غلام محمد کا نام لیا جاتا تھا۔ رام ناتھ کا نام ضمیمے کے طور پر ضرور ساتھ آجاتا تھا، لیکن ریاست سے باہر کے لوگوں کے لیے یہ نام کچھ نامانوس اور اجنبی سا ہے۔ اور اسی لیے آئینہ ساز کو ان کا تعارف مقصود ہے۔

گذشتہ دس، گیارہ برسوں میں بخشی غلام محمد کے علاوہ چند ایسے افراد نے بھی ریاستی عوام پر حکومت کی ہے، جن کا ذکر نہ کبھی اخباروں میں آیا ہے اور نہ کبھی کسی سیاستدان کی زبان پر۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان گمنام شخصیتوں نے تاریخ کشمیر کو

متاثر کیا ہے اور بعض مرتبہ اپنی شخصیت کے جادو سے آنے والے انقلابات کا رُخ بدل دیا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ بات عبرت ناک ہے یا مضحکہ خیز کہ پچھلے برسوں میں رام ناتھ کو بھی کشمیر کی تاریخ میں ایک نمایاں رول ادا کرنے کا موقع ملا۔

رام ناتھ کے عروج کی داستان بخشی غلام محمد کے عروج کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے۔ ان کے والدِ محترم مہاراجہ ہری سنگھ کے دربار سے وابستہ تھے۔ تقسیم سے قبل رام ناتھ ڈیرہ دون میں دوکان کیا کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ جموں چلے آئے اور یہاں ایک چھوٹا موٹا ہیئر کٹنگ سیلون کھول دیا۔ ان دنوں بخشی صاحب جموں کے بادشاہ تھے۔ ایک دن اُس کی حجامت بنانے کے لیے رام ناتھ کو طلب کیا گیا۔ یہ ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا اور یہ دن کشمیر کی تاریخ میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد رام ناتھ شاہی دربار سے واپس نہیں آئے۔ وہ اس کا ایک جزو ہو کر رہ گئے اور انہوں نے بخشی صاحب ہی کی نہیں پوری قوم کی حجامت بنانا شروع کی۔ ۱۹۵۳ء کے بعد بخشی صاحب کو کشمیر کی خدائی سونپی گئی۔ تو رام ناتھ نے بھی اپنی چھوٹی موٹی خدائی قائم کر لی۔ بادشاہ سے قربت کا یہ نتیجہ نکلا کہ رام ناتھ کو بغیر کسی چوں و چرا کے قبول کر لیا گیا۔ سیاستدانوں، وزیروں اور ممبرانِ اسمبلی کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ رام ناتھ کی خوشنودی حاصل کئے بغیر بادشاہ تک رسائی ممکن نہیں۔

رام ناتھ چھوٹے سے قد کے ایک صحت مند بلکہ تنومند آدمی ہیں۔ قد کے تناسب سے ان کا ڈیل ڈول کچھ ناموزوں اور نامناسب سا ہے، لیکن جسے زندگی کی سبھی آسائشیں بغیر کسی محنت اور عرق ریزی کے مہیا ہوں وہ اپنے وجود کے پھیلاؤ کو روک بھی کیسے سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ شاہی دربار سے وابستہ ہونے سے پہلے اس کی حالت کیا تھی۔ لیکن دربار کی وابستگی نے رام ناتھ کو ایک وقار، بانکپن اور اعتماد بخشا۔

رام ناتھ کبھی "میں" کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی ذات کو بخشی صاحب کے وجود سے اِس قدر قریب سمجھتے تھے، کہ سیاسی مسائل پر حلقہ پریذیڈنٹوں، وزیروں اور ممبرانِ اسمبلی سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے ہمیشہ "ہم" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ آئینہ ساز نے انہیں ایک مرتبہ سرینگر ڈسٹرک کے ایک ذمہ دار نیشنل کانفرنسی عہدیدار سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہمیں بار بار تنگ نہیں کیا کیجیے، ہمیں آپ کے جھگڑوں کے علاوہ بھی کچھ مسائل کا سامنا ہے۔"

بخشی صاحب کے عزیزوں، مشیروں اور صلاح کاروں میں سے رام ناتھ ہی کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ وہ ہر لمحے سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہتے اور ۱۹۵۷ء کے بعد جب بخشی صاحب کے بہت سے ساتھی ان سے الگ ہوتے رہے تو اکیلے رام ناتھ اس خلا کو پُر کرتے رہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بخشی صاحب ہر اہم فیصلے سے پہلے رام ناتھ کی رائے جاننا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی لیے مختلف محکموں کے سربراہ، وزرائے مملکت، وزرائے کابینہ، ممبرانِ اسمبلی اور ہونے والے افسروں اور ممبروں کو میں نے اکثر رام ناتھ کی خوشامد کرتے دیکھا ہے۔ دہلی میں ۵۔ پرتھوی راج روڈ پر آئینہ ساز نے اپنی آنکھوں سے ایک گزیٹیڈ آفیسر کو رام ناتھ کے جوتوں کے تسمے باندھتے دیکھا ہے۔ ایک اعلیٰ محکمے کے سربراہ (جن کے پاس اسندا دِ زمانہ سے اب کوئی محکمہ نہیں رہا ہے) رام ناتھ کے بغیر "دخترِ زر" کو ہاتھ لگانا گناہ کہتے تھے۔ رام ناتھ سے دوستی اقتدار سے وابستگی کی علامت تھی اور رام ناتھ کی دشمنی کو زوال کی نشانی کہا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ بخشی صاحب ایک وزیر مملکت سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے انہیں وزارت سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا، وزیر مملکت نے رام ناتھ کو گانٹھ لیا۔ اور اس طرح رام ناتھ کی مسکراہٹوں کے سائے میں انہوں نے زندگی کا یہ نازک

مرحلہ اس طرح طے کر لیا کہ وہ بخشی صاحب سے قریب تر ہو گئے۔ پیرزادہ غلام احمد (سابق چیف سیکریٹری) اگر بخشی صاحب کے بعد کسی سے ڈرتے تھے تو وہ تھے رام ناتھ۔ رام ناتھ کی موجودگی میں احمد صاحب کے چہرے پر ہمیشہ ایک پھیکی ہنسی کھیلتی رہتی۔ ان کی رعونت اور ان کا غرور حرف غلط کی طرح مٹ جاتا۔ یہ رام ناتھ کی شخصیت کا اعجاز تھا یا خود احمد صاحب کی شخصیت کا کھوکھلا پن — کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

رام ناتھ بڑے ذہین آدمی ہیں۔ ان کی تعلیمی استعداد اگرچہ وہی ہے جو پچھلے دس برسوں میں صاحب اقتدار لوگوں کے لیے معین تھی۔ لیکن اپنی ذہانت اور سمجھداری کے بل بوتے پر انہوں نے بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور سند یافتہ لوگوں کو پچھاڑ دیا تھا۔ وہ تھے تو بخشی صاحب کے ذاتی خدمت گار لیکن عوامی حلقوں میں "عکس پروردگار" کی حیثیت رکھتے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر بھی سرفراز ہیں۔ اور کچھ عرصہ سے سرکاری طور پر بخشی صاحب نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن اس کے بارے میں کچھ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

رام ناتھ کو اچھے کپڑے پہننے کا بڑا شوق ہے۔ انہیں اگرچہ لکھنوی نوابوں کا پہناوا زیادہ پسند ہے، لیکن وہ لباس میں تنوع کے زیادہ قائل ہیں۔

شاہجہاں کی طرح انہیں فن تعمیر سے خاصی دلچسپی ہے۔ جموں میں اُن کا اپنا مکان جدید فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔

رام ناتھ میں وفاداری اور وفاشعاری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس دور میں جب بخشی عبدالرشید تک نے بخشی صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا رام ناتھ نے اپنے محسن اور اپنے آقا کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ اسی مستعدی، سرگرمی اور لگن سے بخشی صاحب کی خدمت میں مصروف رہے۔ جس طرح پہلے تھے۔ یہ رام

ناتھ کی شخصیت کا قابلِ قدر اور قابلِ تقلید پہلو ہے۔ لیکن پھر ایک ایسا وقت بھی آگیا کہ بخشی صاحب کو رام ناتھ کی ضرورت نہ رہی اور رام ناتھ کو با دلِ نا خواستہ بخشی صاحب کو چھوڑنا ہی پڑا۔ رام ناتھ جیسے ہاتھی کو پالنا اب بخشی صاحب کے لیے ممکن نہ تھا اور ویسے بھی انہیں رام ناتھ سے بہتر اور موزوں ہم سفر مل گئے تھے۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء

شمیم صاحب

"وہ بڑا بے ایمان ہے۔"

"وہ ایک نمبر کا فراڈ ہے۔"

"وہ باتوں کا سوداگر ہے۔"

"وہ بڑا منہ پھٹ اور گستاخ ہے۔"

شمیم احمد شمیم کے متعلق بہت دیر تک ایک ہی رائے پر قایم رہنا ذرا مشکل ہے۔ اس کی شخصیت بیک وقت اتنی متضاد اور مختلف کیفیات کی حامل ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والے کو ہر ہر قدم پر اپنی رائے میں ترمیم اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میں اس کے بارے میں جو کچھ کہوں گا وہ اسی حد تک صحیح ہے کہ اس کے خاکے کے مکمل کرنے تک میری اس کے متعلق رائے ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کے مکمل ہونے کے فوراً بعد مجھے یہ احساس ہو جائے کہ یہ ہر لحاظ سے نامکمل ہے۔

شمیم صاحب کی پیدائش کا سانحہ سرینگر سے چالیس میل دور ناسنور نا گاؤں میں آج سے تیس برس پہلے وقوع پذیر ہوا۔ ناسنور (جسے فعل نہی سے فعل امر بنانے کے لیے وہاں کے لوگوں نے آسنور میں بدلنے کی سخت کوشش کی، لیکن ناکام رہے) مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروؤں کی ایک بستی ہے۔ جہاں ہر بچہ پیدا ہوتے ہی قادیانی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شمیم صاحب اس دنیائے آفرینش میں قدم رکھتے ہی دنیائے آخرت کی تیاریوں

میں مصروف ہو گئے۔ یعنی قادیانی ہو گئے اور چار پانچ برس کی عمر میں ہی انہیں قرآن مجید، احادیث اور روایات کے اس اسلحہ سے لیس کیا گیا، جس سے مرزا صاحب کے مسیح موعود ثابت کرنے کی جنگ لڑی جا سکتی تھی۔ گیارہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے شمیم صاحب اچھے خاصے مولوی ہو گئے۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ، متقی، پرہیزگار وغیرہ وغیرہ۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ ان کے والد (جو قادیانیوں کے زبردست مخالف تھے) نے قریب کے ایک گاؤں میں قادیانیوں کے خلاف زبردست مظاہرہ منظم کیا۔ ناسنور کے اربابِ دین نے انہیں شکست دینے کے لیے ان کے مقابلے میں شمیم صاحب کو کھڑا کر دیا اور شمیم صاحب نے ایک بھاری اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میرا باپ گمراہی کے راستے پر جا رہا ہے، خدا اُسے صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔" اس کے کچھ ہی دنوں بعد جب اہلِ ناسنور نے شمیم صاحب کے والد کا سوشل بائیکاٹ کر کے انہیں ناسنور چھوڑنے پر مجبور کر دیا، تو وہ بھی ناسنور سے شوپیان منتقل ہو گئے۔ شوپیان میں پہلی بار اس شخصیت کے خدوخال اُبھرنے لگے، جو اپنے مزاج، کردار اور نفسیات کے اعتبار سے نقشِ اوّل سے بالکل مختلف اور متضاد دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اُنہوں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ ایک عدد تخلص رکھ کر فنِ شعر کے ساتھ زیادتیاں شروع کر دیں۔ فنِ تقریر اور خطابت میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ابتدائی تجربے کئے "قادیانیت" کا جادو رفتہ رفتہ سر سے اُترنے لگا اور مرزا صاحب کی جگہ شیخ صاحب نے لینا شروع کی۔ شیخ صاحب کے جلوسوں میں نعرے دینا اور اُن کے جلوسوں میں والنٹیر کی حیثیت سے دوڑ دھوپ کرنا، اُن کی سیاست اور عقیدت کا اظہار بھی تھا اور اپنی شہرت کا سامان بھی! ۱۹۴۷ء تک وہ شیرِ کشمیر کے پرستاروں میں سے تھے۔ ان کی شخصیت میں انہیں پیغمبروں کا جلال اور اقبال کے مردِ مومن کا جمال نظر آتا تھا۔ ان کی تقریروں کا مفہوم نہ سمجھنے کے باوجود ان میں ایک ایسی لذّت اور کیفیت کا احساس ہوتا، کہ اسے الفاظ

کی گرفت میں لانا مشکل ہے۔ ۱۹۴۷ء میں شمیم صاحب یک لخت پاکستانی ہو گئے۔ محمد علی جناح انہیں مسلمانانِ ہند کے نجات دہندہ نظر آنے لگے۔ اور پاکستان ان کے خوابوں کی سرزمین! کشمیر کی عوامی حکومت کے غیر عوامی کردار نے ہندوستان کے تئیں اس کی نفرت میں شدت پیدا کر دی اور ان دنوں وہ شوپیان میں چند ساتھیوں کے ساتھ رات بھر "خوفناک" اور "شرانگیز" پوسٹر چسپاں کرتے رہے میٹرک پاس کر کے جب اس نے سری نگر کے ایس، پی، کالج میں داخلہ لیا تو اس کی وضع، قطع اور گفتگو کا انداز اور طور طریق دیہاتیوں کا سا تھا۔ سخت اور کھردرے بالوں والا یہ دبلا پتلا اور منحنی لڑکا اکثر نائٹ سوٹ پہنے کالج آتا۔ اس کے چہرے سے افلاس، اس کے لباس سے بے چارگی اور اس کی چال ڈھال سے ایک عجیب بے ہنگم پن ٹپکتا۔ وہ تھا تو سائنس کا طالب علم لیکن اپنا زیادہ تر وقت کالج کی ادبی سرگرمیوں میں صرف کرتا۔ معلوم نہیں کہ کس احمق نے اسے سائنس لینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے ذہن مزاج اور افتادِ طبع کو سائنس سے قطعی کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ سائنس کے اکثر پرچوں میں غالب، میر اور مومن کے شعر لکھ دیتا اور جلد ہی اس کے استادوں کو یہ محسوس ہو گیا کہ یہ لڑکا سائنس میں چلنے کا نہیں۔ کچھ مخلص استادوں نے مشورہ دیا کہ سائنس چھوڑ کر آرٹس میں قسمت آزمائی کرو، لیکن وہ اپنی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جوں توں کر کے ایف، ایس، سی، میں پاس ہو گیا۔ لیکن بی، ایس، سی میں آکر اٹک گیا۔ دو بار ناکام ہو کر علی گڑھ بھاگ گیا، وہاں بقول اسکے اس نے ایک ہی سال میں بی، اے پاس کر لیا۔ علی گڑھ میں اس کے ذہن نے ایک اور کروٹ لی۔ اب وہ پاکستانی سے اشتراکی ہو گیا تھا۔ مذہب سے اسکی بیزاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ مولوی شمیم تقریباً کامریڈ شمیم ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ سے واپسی پر اسے بخشی غلام محمد اور صادق صاحب کی اندرونی کشمکش کا کچھ احوال معلوم ہو گیا۔ بخشی صاحب کے داماد میر نصر اللہ سے قربت کی بنا پر بخشی صاحب کے دربار تک رسائی

ہوگئی۔ بیچارگی کے احساس، غیر یقینی مستقبل کے اندیشے، ذہنی سکون اور اقتصادی تحفظ کی تلاش میں بخشی صاحب کی حیات پرور مسکراہٹ نے سہارا دیا اور شمیم نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ وہ سرکاری رسالے "تعمیر" کے ایڈیٹر ہوگئے۔ "تعمیر" کا مقصد پنچسالہ پلان کی پبلسٹی تھا۔ لیکن شمیم صاحب نے اسے بخشی صاحب کی پبلسٹی کا پلان بنا دیا اور اپنے آقا کو خوش کر کے جلد ہی ترقی کے زینوں کی طرف لپکنے لگے۔ دو سال کے اندر اندر وہ کلچرل آفیسر ہوگئے۔ ان دنوں وہ بخشی صاحب کی ناک کا بال تھے۔ بخشی غلام محمد کی سیاسی بدعنوانیوں کے اخلاقی جواز تراشنا ان کی زیادتیوں کو سیاسی جنگ کی اخلاقیات قرار دینا۔ ان کی خامیوں کو علمیت کا معیار ثابت کرنا، اور ان کی ذات کو کشمیر کی نجات سے تعبیر کرنا۔ شمیم صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان ہی دنوں بخشی صادق کی کشمکش اپنے عروج پر تھی اور بخشی صاحب نے صادق صاحب کی اینٹوں کا جواب پتھروں سے دینے کے لیے "حقیقت" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کر دیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اس ہفت روزے میں جتنی دشنام طرازی ہوا کرتی تھی وہ سب شمیم صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوا کرتی تھی اور شمیم صاحب اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے اور ان کا معاوضہ حاصل کرنے کے لیے بخشی صاحب کے مخالفوں پر ہر پہلو سے وار کرتے تھے۔ بعض سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ "ترقی پسندوں" کی منظم جماعت کلچرل کانگریس میں انتشار اور پھوٹ پیدا کرنے کا کارنامہ بھی ان ہی کے ہاتھوں انجام دیا گیا۔ شمیم صاحب کی ان ہی خدمات کے عوض میں انہیں سرکاری جیپ کا ناجائز استعمال کرنے کی مکمل اجازت دی گئی تھی۔ پھر ایک دن خبر آگئی کہ بخشی غلام محمد کو شمیم صاحب کی وفاداریوں پر شبہ ہوگیا ہے۔ کافی ہاؤس اور کئی اور مقامات پر شمیم نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں، جن سے بغاوت اور نافرمانی کی بو آتی ہے اور بخشی صاحب شمیم سے بے حد ناراض ہیں۔ شمیم صاحب سے ان کی سرکاری جیپ چھین لی گئی اور وہ مستعفی ہو کر علی گڈھ کو روانہ

ہوگئے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ ایل۔ ایل۔ بی کر رہے ہیں، لیکن چند ہی دن بعد سری نگر کے لوگوں نے پھر شمیم صاحب کو کافی ہاؤس میں جلوہ گر دیکھا۔ وہ ایل۔ ایل۔ بی۔ کا ارادہ ترک کرکے پھر سرکاری ملازمت کی کھونٹی پر بندھ گئے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ان کو کافی ہاؤس میں دفتری اوقات کے دوران کافی پینے کی پاداش میں معطل کیا گیا۔ اب شمیم کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ سرکاری ملازمت میں وہ سکون، وہ اطمینان اور وہ آسائش میسر نہ ہوسکے گی، کہ جس کا وہ خواہاں ہے۔ اسلئے اُس نے ایک بار پھر علی گڈھ کا رُخ کیا اور ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کرلیا۔

شمیم صاحب کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے زیادہ تر متاثر کیا ہے، وہ اس کا کھلنڈرا پن ہے۔ وہ دنیا میں کسی بات پر سنجیدگی سے سوچنے کے لیے تیار نہیں، یہ کسی کی زندگی اور موت کا ہی مسئلہ کیوں نہ ہو۔ وہ ہنسنے اور ہنسانے کے لیے کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لے گا۔ باوجود اس کے کہ وہ آجکل آئینہ میں بہت ہی سنجیدہ اور اہم مسائل پر بظاہر بڑی سنجیدگی اور متانت سے بحث کر رہا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کی یہ سنجیدگی بھی اس کے کھلنڈرے پن کا ایک پہلو ہے۔ وہ دراصل چٹکیاں لے لے کر خود محظوظ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہاں کے لوگوں میں اب ہنسنے کی ہمت نہیں، اسی لیے وہ خود رونی صورت بنا کر لوگوں کو رُلانا چاہتا ہے تاکہ پھر اُن کی اس حماقت پر وہ جی بھر کر ہنس سکے۔ وہ انتہا درجے کا باتونی ہے۔ اُسے تقریر کرنے کا بے حد شوق ہے اور وہ بے تکان گھنٹوں بولتا رہتا ہے۔ اور غالباً اپنے اسی شوق کو پورا کرنے کے لیے اسے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی سوجھی ہے اور سیاسی طور پر ابھی اُسے اپنی منزل نہیں ملی ہے۔ اس کے نظریات میں وہ ٹھہراؤ، وہ پختگی اور توازن نہیں جو ایک باشعور نوجوان میں ہونا چاہیئے۔ وہ فکری طور پر نابالغ اور اپنی ساخت کے اعتبار سے ابھی تک عنفوانِ شباب ہی کی منزل میں ہے۔ وہ بیک وقت اشتراکی

مسلمان، نیشلسٹ اور فرقہ پرست ہے۔ اس لیے سیاسی نظریات میں اتنا تضاد اور INCONSISTENCY ہے کہ "آئینہ" کے قارئین کو پانچ سال سے یہی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور اس کا اپنا مثبت نظریہ کیا ہے۔ وہ پچھلے چند سالوں میں اس تیزی کے ساتھ اپنے اعتقادات بدلتا رہا ہے، کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ کیا ہے۔ آج سے چند ماہ پہلے وہ صادق صاحب کا زبردست مداح تھا۔ آج وہ اُن کا سب سے بڑا نقاد ہے اور غضب یہ ہے کہ اپنی ہر "تبدیلی" کے لیے ایسے ایسے حسین جواز تراشتا ہے کہ دوست احبابِ مُنہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

شمیم کو ایک اور فن میں ید طولیٰ حاصل ہے اور وہ ہے مُنہ پر گالی دینے کا فن۔ وہ اتنا گستاخ اور مُنہ پھٹ ہے، کہ بعض اوقات بداخلاقی کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ اس کی زبان قینچی ہے اور اس میں ایسا زہر بھرا ہوا ہے، کہ جب بھی چلنا شروع ہوتی ہے تو چاروں طرف زخمیوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ دشمن بنانے اور دوست کھو دینے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ اور جب سے اس نے "آئینہ" نکالنا شروع کیا ہے۔ اس نے ساری کائنات کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ وہ بڑا بے ایمان ہے اور سچ بول کر لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اس میں تعمیر کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں، لیکن اس نے اپنی تمام قوتیں تخریب میں صرف کر رکھی ہیں۔ وہ سیاسی دُنیا کا سعادت حسن منٹو ہے جو چونکا دینے پر یقین رکھتا ہے۔ آپ شمیم سے نفرت کر سکتے ہیں، اس کو گالی دے سکتے ہیں، اسکے خلاف سازش کر سکتے ہیں، لیکن آپ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی شخصیت کو منوانے کا گُر جانتا ہے! اور جب سے وہ اسمبلی کا ممبر بن گیا ہے۔ اس نے اپنے اخبار "آئینہ" کو اپنی ذات کا اشتہار بنا دیا ہے اور اسی لیے مشہور اُردو مصنف ظ۔ انصاری نے "آئینہ" کو شمیم صاحب کی ذہنی صحت کا بلیٹن یا اُن کی "صحیح بخاری" قرار دیا ہے۔ عام لوگ "آئینہ" کو شمیم گزٹ اور شمیم نامہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ پچھلے دو تین سال سے اس

میں شمیم صاحب کی تقریروں، ان کی مصروفیات، اور ان کے لطائف کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں حلقہ شوپیان سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ان کی کامیابی ایک ایسا معجزہ ہے کہ خود شمیم احمد شمیم جیسے کافر کو بھی خدا کی قدرت اور اُس کی وحدت پر ایمان لانا پڑا۔ لیکن کامیابی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ خدا کو بھول جانے کے ساتھ ساتھ اپنے ووٹروں کو بھی بھول گئے۔

شمیم صاحب میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں، لیکن ادب چونکہ زیادہ ریاض، لگن اور توجہ چاہتا ہے، اس لیے شمیم صاحب نے اپنے لیے صحافت کا راستہ اختیار کیا ہے۔

(سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

1937-1980